

北

سہ ماہی شاعر

شاعر کے خریدار و تارکین سے گزارش ہے کہ اب وہ اپنے
زیر سالانہ کی ترسیل اور خط و کتابت کے لئے صرف
نیا پتہ ہی استعمال کریں۔ نیا پتہ نوٹ کر لیجئے

خط و کتابت کا پتہ

منی آرڈر، رجسٹری وغیرہ کا پتہ

ماہنامہ شاعر
پوسٹ بکس نمبر — 3770
تحریک کام پوسٹ آفس، بمبئی ۴۰۰۰۰۴

ماہنامہ شاعر
۲۲۸-۲۰۲ دینا تھ بلڈنگ
بی۔ بی۔ مارگ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۴

یکم مئی ۱۹۹۵ء سے نیا پتہ نافذ العمل ہوگا



Change in the Address of 'Shair'

Readers of the 'Shair' are hereby informed that with effect from 1-5-1995 the address of 'Shair' is changed. Kindly use the new address for all your correspondences and remittances of annual subscription

The New Address is

For Correspondences

'Shair' Monthly
PO Box No. 3770
Girgaon H.P.O.
Bombay 400 004

For Moneyorder and

Registered Articles.

'Shair' Monthly
202-228, Dinath Building,
P.B. Marg, Bombay 400 004.

فکر امروز



علم، اصل ہے اور ادب فرع ہے۔ علم سرچشمہ ہے اور ادب اس کی ایک لطیف مویج۔ علم ایک چمنستان غیر محدود ہے اور ادب اس کی بہار معطر۔ علم کے معنی دانستن یعنی جانتا ہوں۔ موجودات کی گونا گوں نوعیات کے گونا گوں علوم بھی ہیں، مثلاً علم الاشیا، علم الانسان، علم اللہ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں نفس موضوع علم اللہ سے متعلق ہے اور ادب اسی کی ایک شاخ ہے۔ علم اللہ ہر ملک کی زبان سے تعلق رکھتا ہے اور ہر مدرس گاہوں یعنی مکتب، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل کیا جاتا ہے، مگر ادب، ذہن و دماغ کا وہ جوہر ہے جو انما یہ ہے جو اکتسابِ علوم و فنون کے بعد صرف ادعاک و معارف کی قوت سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں درس گاہوں میں ادب الائنہ کے نمونے تو مل سکتے ہیں، مگر وہ دماغ، جو ادب کا خلاق ہو، صرف فطرت کی ودیعت ہی کا وہین منت ہے اور کسی نوعیت سے بھی آشتابی نہیں کہا جاسکتا۔

[۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء]

سیلاب اکبر آبادی

173273

5050 345.02

پیداوار
انجمن علمی
نظم
اشاعت
۹۹ سال
علم ادبی
و تہذیبی
اہتمام

فون: ۳۸۴۹۹۰۴



جلد — ۹۹
شمارہ — ۲

2-3 (6)

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زیر سالانہ
۴۵ روپے
لاٹریوں سے
۹۰ روپے

تاخر خسرو پوری
۱۰۰ روپے
معاونین سے
۱۰۰ روپے
مالک غیرے
۲۵ ڈالر - ۱۵ پونڈ

۲۶

نیم ... تدریس ...
 در موضوع ...
 افغان ...
 ...
 ...
 ...
 ...
 ...

पोस्ट कार्ड

जवाबी के पो १७

केवल पता

AGANG -
-MAHA

1954

نام ...

پता ...

डाकरखانا ...

...

نیاز فقیری بنام ابو محمد عمر

نیاز محمد خان [نیاز فقیر پوری] ریاست علی خان [نادیجی نام] پ: سنی گھاٹ ضلع بلوچکی
 ۱۳۰۲ مطابق ۱۸۸۳ م: ۴ مئی ۱۹۵۴ م: کراچی، پاکستان



پہلے اے

پہلے اس تحریر کو پڑھ لیجئے

یکم مئی کے پندرہ روز پر موجودہ کی بنا پر فاعر کے ہتے میں تبدیلی کی جارہی ہے۔ اب خط و کتابت کے لئے نیا پوسٹ بکس نمبر 3770 نوٹ کر لیجئے۔ اپنے رسالہ کے مئی آرڈر، ریزرو اور SPEED POST وغیرہ کے لئے ۲۲۸۰-۲۰۲۰، دینا تھ بلڈنگ، پانی مارگٹ بمبئی ۴۰۰۳۴ کا پتہ استعمال کیجئے۔ اس طرح آپ کے مئی آرڈر، ریزرو خطوط اور پارسل وغیرہ محفوظ طریقے سے ہم تک پہنچ جائیں گے۔ شاعر کے وابستہ اپنے دیگر اخبارات میں شاعر کے نئے ہتے کی تبدیلی کی اطلاع دیکھ گئے ہتے کو فعال بنانے کے لئے ہمیں ایک خط فروریکھ دیجئے۔

ہم عہدار ادب نمبر کو مکمل کرنے میں تھوڑی روز کی منتظر کے باوجود شاعر کے نام شمار بھی قارئین تک پہنچ رہے ہیں۔ جنوری، مارچ کے شمارے اور خاص نمبر سے قبل اپریل ۹۵ کے شمارے کے ساتھ آپ تک خاص نمبر کی مکمل تفصیلات پہنچ جائیں گے خاص نمبر دو جلدوں میں شائع ہوگا۔ خاص نمبر کے صفحات، قیمت، خریداروں کے لئے رعایتی قیمت، اشتہار کی شرح، کتب رسائل کے اشتہار کی نئی رعایتی شرح اور دیگر امور سے متعلق معلومات آپ تک پہنچانے کی تیاریاں جاری ہیں۔ آئندہ چھ ماہ اور سال ۹۵ء شاعر کے آپ کی وابستگی اور مصروفیت کا سال ہوگا۔ کسی رفاقتی فاعل نمبر کے لئے ہر طرح کے خاکوں، ماوراء، مسوین، مدی کی ہم ترین ادبی دستاویز کے لئے رفیقان شاعر اپنے ہر ممکن تعاون کے لئے تیار ہیں۔ کہیں آپ شاعر کے عقیدہ مثال خاص نمبر سے محروم نہ رہ جائیں۔

آپ کہیں بھی ہوں، شاعر کے خاص نمبر کے حصول کے لئے باغ و بھیں شاعر سے اپنے اپنے شہر یا علاقے کے کتب فروش سے رابطہ رکھیں۔ اپنے بقایا بچا اور عابد ہینڈل میں مکت خریداری پر نظر کیجئے اور دیکھئے کہ کسی وجہ سے آپ خاص نمبر کے حصول میں ناکام نہ رہ جائیں۔

ضروری گزارش ہے کہ

- ☆ اپنے بقایا جات جلد ارسال کیجئے۔
- ☆ اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہو تو اپنا زر تعاون جلد بھجوائے۔
- ☆ نئے رفیقان شاعر اپنا زر سالانہ ارسال کر کے خاص نمبر کی رعایت یافتگانہ اٹھائیں۔

تحریر

انٹائیو اور اردو انٹائیو نگاری ۵ دنیا میں عنایت

رقبہ ۱۲ رقبہ جامی
انسان، جانور اور درخت ۱۹ خالد سہیل
میری غزل ۱۹ خالد جاوید
ذمہ داری ۳۰ شمس الدین
سوچ ۳۰ حنیفہ ترین
نوحہ [انگریزی] ۳۰ نوشاد احمد خاں
[ترجمہ] • ریحانہ ثروت

دسترس ۱۳ قیوم شاہ
گفت ۱۴ منہ ابو الحسن
آتش ۲۰ انلے عکبر
شطح کے ہرے ۲۳ شکیلہ جاوید
تصادم [نارنگی] ۲۸ شیل اسکسنے
[ترجمہ] • سعید انجم

خلیلہ نویر ۱۲ ہدی پرتا بھٹا
بہلے نقشبند ۲۳ حنیفہ اختر ۲۳ تابش مہدی ۲۳
انعام الحق جاوید ۲۴ اشرف غوری ۲۴ اکرام تبسم ۲۴

۵ غزلیں ۲۴ اعجاز صدیقی

غزل ۱۵ شبنم کانت نظام
غزل ۱۵ منتہا رشید

نیاز فتح پوری [نام] ۱۲ ابو محمد سحر

پہلے اس تحریر کو پڑھ لیجئے ۱۳ ۱۵ ۵۵

۱۳۱ ۳۱
۱۳۱ ۳۱
۱۳۱ ۳۱

۱۳۱ ۳۱

تلا اکھرنے بدای تھا سوال کا رنگ
چھٹک تھا کئی چہروں سے ہنسا کا رنگ
دھل کدوں کو تیسرے، زحمت لذتوں کو
تسہ ہصال کی خوشبو، ترسے ہمال کا رنگ
نظر اشارہ کنال لب ترہیب لفظ وصیت
وہ جذب شوق کا عالم یہ عرض حال کا رنگ
ذرا سی در کو چہرے دگ تو جاتے ہیں!
خوئی کا رنگ ہوا یو غم وصال کا رنگ!
جس تباروں میں ہے کھلیں تولد میں رنگ
ہے ان دونوں ہی زخموں کے اندل کا رنگ!
زمانہ بانی کہا لی سنا رہا ہمت بھی
اچھڑا تکر آفت از میں مال کا رنگ!
کوئی زبان، کوئی طرز زواست کام آئی
ہے لاجواب آگیا ہر اک سوال کا رنگ
ہٹ ہوئے نیک شش بوخ میں بھی سرے
جما ہوا ہیں نقابا با حال کا رنگ
مرے ہی چاک گریلوں سے ہفت شب کی نمود
مرے منہ سے عبارت ہوا سوال کا رنگ
ایس وقت ہے تو، تو ہیں وقت سے آواز
تسہ طرے سے اچھا مرے زوال کا رنگ!
بہاں تھنہ گل میری من کر ہے اعجاز
مثیل توں تر ہے مرے خیال کا رنگ

چند سہمی غزلیں

★

م: فروری ۱۹۷۷ء

کٹا نہیں، ہر چیز کوئی کاٹ رہا ہے
شاہد مرا پیہر کی پھر کا بنا ہے
اکثر ایسے پڑھ کر مجھے ہنسائی پڑا ہے
جو کچھ مرے، افسوس کی کیڑوں کی گھبراہٹ
وہوٹا ہے بے ہنگامی اس کی لذت
افرش کو سنبھلنے کے لئے جلا ہے
جو کچھ ہے وہ ہے اپنی رفتار پہ خوف
جنوم مفر، وقت کی رفتار میں کیا ہے
ہم نام سا، ہم شکل سا، ہم صوت و صدا سا
تھ سا کی کوئی شخص مرے ساتھ رہا ہے
میں جنس گراں مایہ زدایہ ہوں کیا ہوں!
بازاد ہر شخص مجھے دیکھ رہا ہے
تھ کہ کبھی میں ایک کہتی میں سرگوشیاں نہ ہوں!
یہ شبہ جو کچھ دوز سے ہے لفظ و صدا ہے

مذخروں، گل بدلوں، زہرہ جمالوں سے ملیں
ہو کوئی پیار کا صحر تو غنہ دلوں سے ملیں
سستہ مہر و وفا اور سب سے ادب سے
داغ کچھ اور ہمیں چاہئے والوں سے ملیں
دستوں کا ہیں اور داغ ہے منزل کا شعور
ہوں جو گراہ، وی مت لے والوں سے ملیں
بیموں کی اور کے گھر جائیں یہ اوج بلا
انہیں لٹا ہے تو یہ ہم سے جیت لوں سے ملیں
ہم نے جو حال میں کھینچے ہیں غمت کے خطوط
میں ملن، کردہ ماحول کی مثالوں سے ملیں
ہم جنوں پیشہ دی عاقبت اندیشیں سہی!
چہر بھی لوگ آئیں، ہم آوارہ خیالوں سے ملیں
آج وہ طرفہ دستار بنے پھرتے ہیں
بے کمالی کے نشان جن کے کہلوں سے ملیں
ظلمت جہل میں مانگے کا اُٹھ لائیں
جو خیالات کمت لوں کے حوالوں سے ملیں
بارگشت اب بھی جو ہوں کی ہے شرمندہ گوئی
فرصتیں کاٹیں ہیں اپنے سوالوں سے ملیں
تھپ کے کہیں تو اندھیروں کا ہوا اس شہ
ساتے نہیں تو سوزنہم اجالوں سے ملیں
دن کو چھوٹی ہے اس طرح خیالات کی قد
نکلیاں جیسے لپکتے ہوئے جالوں سے ملیں
جن کی تاریخ جنوں ہے سوسہ شیشی و محقر
دہنائیں تو ہماری ہی مثالوں سے ملیں

اعجاز صدیقی

شعار خود بگڑ و خود فنا کو بند کرد
دکھائی غنہ و اوجا کو بند کرد
دماغ کھول دو کھڑی مقیسوں کیلئے
غور و مشورہ و ناز و نوا کو بند کرد
خود اپنے لیے گریاں میں جھانک سیکم
طریق بہت صاف تھا کونہ کونہ کرد
یہ ترہیں ہو کھانوں میں جیسے شمع
گرد و غبار سے مرصع کو بند کرد
لگی ہے آگ سلامت کے شعلہ صواب
نکلیاں تو گھٹا تو، صحت تو کونہ کرد
نہیں ہے کوئی صحت و صبر کی جسد کا علاج
وہاں ہے ہاتھ اٹھا، دوا کو بند کرد
یہ پھر صحت ہی پر کدہ ہے تو کانی ہے
برائے نام ہی رسم و سنت کو بند کرد
ابھی تو دہلیز زمانہ صحت سے کھلا
خوئی کو غم و سوسائیں ہی آنا کو بند کرد
یہ خود کو کدہ پرست کوئی نہ سنا ہے!
ہوا پد دھک نکلا، گھٹا کو بند کرد
نصرتوں سے ہیں جالے ابھی تیں آدھی
شعاع صبح نور و صفا کو بند کرد
جڑو سلسلہ ہاتے زخموں نیل آئیں!
جو ایک سلسلہ ناز و کد کو بند کرد!!
منا و جیب و گریباں کی اپنے لیے اعجاز
اس کی فکر و خیالوں آتما کو بند کرد

لوگ کس لئے آخر، حقوڑی دھڑیوں چل کر، ساتھ ساتھ آئے ہیں
ہم تو خودی رہ رہتے، خودی اپنی منزل تھے، جب قدم اٹھائے ہیں
میکھو ابھی تک تو، بات صحت سہی ہے، دھیں جاؤ دینا تک
ان کا ذکر بھی پھیرو، جن کی صحت نظر لوں نے، میکہ بے بنائے ہیں
ہم نقیب بیلاری، ہائے سے سر شادی، نیند آئی جانی ہے
عارضوں کی رنگت ہے، انھوں کا حادو ہے، گیسوں کے شلے ہیں
میکہ جب ان کا ہے وضع میکہ ان کی، احتیاط کیا جانے
جاؤ خوب بھلا کاتے، مستیاں بھیری ہیں غم پر غم نہ کھائے ہیں
ہم سے آنسوؤں میں بھی، دکھائی نہیں پیدا، روکھن نہیں پیدا
مسکرائے دلے تو، داری بلسدی پر، جا کے مسکرائے بھی
جو لب صحت پر آئے، اس کو کتنے دیں، احتیاط لے مئے دیں
دل کی وار داتوں میں، آپ لفظ و معنی کی، تہید نہیں لگائے ہیں
دیکھنا فقط ہے، ان میں اپنی رنگت ہے، ان میں اپنی خوشبو ہے
موسم بہاؤں نے، بھول لی تو کتنے ہیں، باغ میں کھلائے ہیں
دوشنی کے شیدا ہیں، ہم بھی اوتھم بھی، ہو فرق صرف اتنا ہے
تیرہ رنگداروں میں، تم دسے جلاتے ہو، ہم نے دلی جلاتے ہیں
ہر نفس سے لرزیدہ زندگی سے ہیں پیدا، تھر تھرا ہیں اعجاز
آج کل کی دنیا میں، آدھی نہیں شاید، کدلی کے ساتے ہیں



وزیراعلیٰ

۱۰۔ سولہ ستمبر، سرگودھا، پاکستان

انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری

انشائیہ کیا ہے ؟ ہمارے ہاں بچے تین برس سے اور مغرب میں کم و بیش پچھلے تین سو برس سے یہ بحث جاتا رہے کہ انشائیہ کیا ہے مگر تاحال انشائیہ کی کوئی ایسی تعریف یا DEFINITION سامنے نہیں آسکی جو اس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ غلط فہم افاد کیا کہ انشائیہ بحیثیت صنف ادب ناقص ہے۔ کیوں کہ اس کی حدود متعین نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دیگر اصناف ادب کی حدود کا تعین ممکن ہو سکتا ہے ؟ کیا ہم غزل یا افسانہ کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا ہیں ؟ دوسرے حصوں میں کیا ہم ان کی کوئی ایسی تعریف، وضع کر سکتے ہیں جو حتمی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر اشیاء اور مظاہر کو ہم پہچانتے تو ہیں مگر ان کو بیان نہیں کر پاتے۔ مثلاً میں آپ سے پوچھوں کہ خلافت کیلئے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے ؟ جی کہ میں اسے سچا بتاؤں اور باستانی اسے نشان زد کر سکتا ہوں مگر سوال یہ ہے کہ کیا آپ اسے بیان بھی کر سکتے ہیں ؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ سو اصل بات یہ ہے کہ کیا آپ نے خیال دئے یا منظر کو پہچان لیا ہے ؟ ہیکل، پکائی، من۔ ان میں سے کسی کی بھی حتمی تعریف ممکن نہیں لیکن پہچان بہر حال ممکن ہے۔ میں آپے اصحاب سے یہ بات یاد باور کرتا رہا ہوں کہ جس طرح آپ غزل کے ہزاروں اشاریہ سے صحیح غزل شعریہ کو پہچان کر مراد لکھ لیتے ہیں کہ غزل کا شعر ہو گیا، اس طرح آپ توہیت، دریاہت، اور بار بار مطالعہ سے انشائیہ کو طرز، مزاجیہ، فلسفیانہ، سائنسی یا دیگر موضوع کے مضامین سے باستانی الگ کر سکتے ہیں۔

اس دنیا میں ہر شے دوسری اشیاء سے جڑی ہوئی ہے اور ہر خیال ہزاروں دیگر خیالات کی دھڑ سے بندھا ہوا ہے۔ لہذا جب آپ شے یا خیال کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں تو اور دگر دگر کے ہزاروں پیش پا افتادہ خیالات اور سچی پٹائی باقی بھی آپ کی تحریر میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یوں آپ کی اور جملہ موضوع کے رائے میں ایک قسم کی نکاوٹ یا تعلق ہوتا ہے۔ جب تک اس نکاوٹ کو دور نہ کیا جائے آپ پر موضوع کے ان چھوٹے پہلوؤں کا کشف نہیں ہو سکتے۔ انشائیہ نگار کا اصل کام یہ ہے کہ وہ موضوع پر خود کو اس طور پر مرکوز کر لیتا ہے کہ اور دگر دگر کے موضوعات کی مداخلت بے جا نہیں ہونے لگتی ہے۔ پھر وہ موضوع کے ساتھ اس طور پکھینے لگتا ہے جیسے وہ پہلی بار اس سے آشنا ہوا ہو۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہی کا اندازہ نظر بھی انشائیہ نگار کا ایسا ہے کیوں کہ وہ بھی اور دگر دگر کی اشیاء اور مظاہر کو پہلی بار دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بچہ تو براہ راست مظاہر کی نیابتی کا ادراک کرتا ہے جب کہ انشائیہ نگار پہلے موضوع سے جڑی ہوئی پیش پا افتادہ باتوں کے پھیلنے کو اٹاتا ہے۔ پھر اس کے ان چھوٹے پہلوؤں تک رسائی حاصل کر کے بچے جی کی طرح حیرت زدہ ہوتا ہے۔ یوں گویا وہ اپنے تخلیقی باطن کو براہ کثرت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

آج سے کم و بیش تین برس پہلے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا:

ZEN AND THE ART OF MOTOR-CYCLE MAINTENANCE

مصنف کا نام تھا رابرٹ ایم پرگ ! سنئے میں آیا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی چند اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں ایک بچہ یا قادیان ہوا ہے کہ کسی امریکی پروفیسر نے اپنی کلاس کی ایک طالبہ سے امریکہ پر مضمون لکھنے کو کہا چند روز بعد وہ طالبہ پروفیسر کو موصوت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ وہ مضمون نہیں لکھ سکی۔ کیوں کہ اسے امریکہ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہو چکی تھی جو پہلے سے معلوم نہ ہو۔ تب پروفیسر کو موصوت نے اس طالبہ سے کہا: اچھا! اگر یہ بات ہے تو اپنے موضوع کی کتابیں کھینچو اور امریکہ کے بھانے اپنے شہر پر مضمون لکھ لاؤ۔ چند روز کے بعد وہ طالبہ آئی اور کہا اب کی بار بھی اسے کوئی نئی بات نہیں ہو چکی! اس پر پروفیسر صاحب جڑ بڑھ گئے۔ اور طنزاً کہا کہ اگر تم اپنے شہر پر بھی مضمون نہیں لکھ سکتیں تو شہر کے اوپر ہاؤس کے صمد لکھانا ہے پر اپنی

توجہ مرکوز کرنا اور اس کے بائیں جانب کی اینٹوں کو موضوع بنالو۔ یہ کہہ کر پورے غیر موصوف مسکرائے اور بات آئی گئی جو گئی۔ تاہم چند ہی روز کے بعد وہی طالب پانچ ہزار پانچ سو ایک مضمون لکھ لائی، کہا کہ میں نے چند سطریں پہلی اینٹ پر، مزید چند سطریں دوسری اینٹ پر لکھنے کے بعد جب تیسری اینٹ پر لکھنے کا آغاز کیا تو گویا دیبا کبندہ ٹوٹ گیا اور ان پچھوٹے خیالات کے ایک سیل رواں نے آگے بڑھ کر مجھے شراور کر دیا۔ دیکھا جائے تو اس طالب نے وہی طریق اختیار کیا تھا جو ایک انشائیہ لکھ کر تھلپ ہے۔ انشائیہ نگار بھی نے یہ خیال کو اس کے ماحول سے کاٹ کر مقصود بالذات قرار دیتا اور یوں قطرے میں دجلہ دریافت کرتا ہے۔ اس کام کے لئے وہ پٹے چھوٹے اور باحال طریق کار کو ترک کر کے ایک نیا زاویہ نگاہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً وہ نے یہ موضوع کے پیچھے ہونے پہلوؤں کو جاننے کے لئے یا تو اپنی جگہ سے سرک کر اسے دوسری جانب سے دیکھتا ہے یا پھر نے یہ خیال کو اس کی متعین جگہ سے ملا کر اس کے حقیقی دیار پر ایک نظر ڈالنے کے۔ دونوں باتوں کا ایک ہی مقصد ہے یعنی موضوع کے ان دیکھے پہلوؤں تک رسائی! اس نکتے کو بیان کرنے کے لئے ہم نے انشائیہ پر لکھ گئے اپنے مضامین میں متعدد مثالوں سے کام لیا ہے۔ مثلاً ایک بگڑی نے لکھا ہے کہ فرض کیجئے آپ دنیا کے ایک کنارے سے اس کے دوسرے کنارے کو سال یا سال سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ لہذا ایک مستقل نوعیت کی تصویر آپ کے ذہن پر مرتسم ہو چکی ہے۔ اب آپ کسی روز دوسرے کنارے پر جائیں اور وہاں سے پہلے کنارے کو دیکھیں یا دوسرے کنارے ہی کو دیکھیں تو آپ کو ایک بالکل نیا منظر دکھائی دے گا اس طرح بچپن میں مڑے بالے اکثر اوقات جھک کر اپنی ٹانگوں میں ملے ماحول کو دیکھتے ہیں اور غور سے ہوتے ہیں کہ انہیں ہر روز کا دیکھا جھالا منظر بالکل بلا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ عام زندگی میں دیکھنے کو آپ جب کسی میدان کو ہوا درستی سے دیکھتے ہیں تو آپ کو اس کا حصہ ایک دیگر DIMENSION نظر آتا ہے لیکن اگر آپ قریبی مہارت سے اسی میدان پر نظر ڈالیں۔ تو آپ کو ایک اور ہی منظر دکھائی دے گا۔ توجہ دینے سے کہ آپ اپنی حقیر جگہ سے سرک جائیں۔ یہی انشائیہ نگار بھی کرتا ہے۔ وہ دریافت، مادت اور ان کی دیواروں کو پار کر کے جب ایک نئے کی سی حیرت آمیز صورت کے ساتھ اپنے ماحول کو دیکھتا ہے تو اسے وہ صوبہ کچھ نظر آتا ہے جو سر پر جاری علم رکھے، تاک کی سیر میں چھوک چھوک کر قدم رکھے والے بزرگوں کو کبھی دکھائی نہیں دے سکتا۔

بات کی وضاحت کے لئے میں اردو کے ایک انشائیہ "اندھی" کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں "اندھی" ماننے کا ایک موصوف ہے۔ جب آپ اس پر کچھ لکھیں گے تو معلوم کو لغت ہی کا سبب اس لئے مثلاً یہ کہ جب کسی علاقے میں ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے تو اس سے طے علاقے سے جہاں ہوا کا دباؤ زیادہ ہو۔ ہوا کے تند و تیز ریلے اٹھ اٹھتے ہیں اور اپنے سفر کے دوران مٹی ریت اور جھانکے کا بھی اٹھا لاتے ہیں۔ اسے ہم "اندھی" کہتے ہیں یا یہ کہ "اندھی" سے بہت نقصان ہوتا ہے، چھینیں اور جاتی ہیں، درخت گرتے اور انسان مر جاتے ہیں وغیرہ۔ اب اگر آپ "اندھی" سے کوئی مزاحیہ صورت حال پیش کرنے کے موڈ میں ہوں تو آپ وہی رویہ اختیار کر سکتے ہیں جو برسات کے سلسلے میں تھیرا کیر آبادی نے کیا تھا۔ اس سے برسات سے پیدا ہونے والی مھلک صورت حال پر نسبتاً زیادہ توجہ مبذول کی گئی تھی اس کی نظم کا ایک بند مجھے یاد آ رہا ہے۔ تھیرا کیر آبادی نے لکھا تھا

کرتی ہے مگر صوبہ کو پھسلنی زمین خواہ
عاشق کو برو دکھائی ہے کچھ اور بھی ہمار
آیا جو سارے کوئی محبوب غلوں دار
گرے کا مگر کہہ اچھل کو دایکت بار

اس شاعر علی بدن سے یہت کر چھل پڑا

اس طرح جب "اندھی" کے موضوع پر طرہ یا مزید لہجہ اجماع یا مقصود ہو تو آپ رسم کیانی موزون کا قیام کر سکتے ہیں۔ ایک بار جب کیانی صاحب جھکے ہوئے ہوا آدھوٹا کے لئے بدنام ہے تو اس نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جھک کر کے بارے میں یہ کیسی غلط بات مہربان ہے کہ یہاں آنڈھیاں بہت آتی ہیں حالانکہ میرا یہ تجربہ ہے کہ محکم میں سال بھر کے دوران صرف ایک بار "اندھی" آئی ہے جو اپریل سے شروع ہو کر اکتوبر تک جاری رہتی ہے

انشائیہ کا میدان طرہ، مزاح یا مصلو ماتی طرہ کے مضامین سے قطعاً مختلف ہے۔ چنانچہ میں نے "اندھی" کے موضوع پر لکھ گئے جس اردو انشائیہ کا اوپر ذکر کیا ہے اس میں "اندھی" کو طرہ یا مزاح کے لئے استعمال نہیں کیا گیا بلکہ "اندھی" کو مقصود بالذات قرار دے کر اس سے انشائیہ نکات پیدا کیے گئے ہیں مثلاً

"اندھی" کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ یہ آپ کی توجہ کو بیرونی مظاہر سے ہٹا کر اندر کی اندیشی پر مبذول کر دیتی ہے۔ یہ جو طرہ، ایمان، بندہ وستان اور زمین نے رنگ اور کائنات کے بارے میں فلسفیانہ نو شکائیاں کیں۔ کیا ان کا باعث ان ممالک کے لوگوں کی بعض غیر معمولی صلاحیتیں تھیں؟ ہرگز نہیں۔ ان کا باعث صرف یہ تھا کہ قدرت ان ممالک کو قرن باقرن تک "اندھیوں" سے نوازتی رہی اور اس کے باسیوں کی ظاہری آنکھوں میں خاک جھونک کر انہیں اپنے "اندھ" کی توجہ اور دنیا کو منہ کرنے پر راغب نہ کی۔

۲۔ آندھی فطرت کی جادوب کش ہے۔ اس کا کام تیزی اور چھوٹی سے کوہ و محو و خبر و دیہات اور باغ و باغ کو ہر طرح کے نس و خاشاک سے پاک صاف کرنا ہے۔ ہمارے شہر و ملک کے بیرون پل کمشروں کو آندھی کے طریق کار سے صاف لینا چاہئے۔

۳۔ آندھی کی برکتیں ان گنت ہیں، آندھی کے چھیرے تعین اور قریب کے سارے پردوں کو چاک کرنے اور ہر قسم کی اصلیت کو نکال کر رکھ دینے ہیں۔ جسک سارا ان ساحل کو شاید یہ بات پسند نہ آئے لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھی کے بے رحم چھیروں ہی کی رہیں منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی اس کی حالت قابل رحم اور اس کی ذہنی پگلی محل نظر ہے۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح الشائیر نگاہ نے ہیں تصویر کو دوسرا رخ دکھا کر آندھی کی مضبوطی سے کی ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اس کے مزاج یا طرز محرم منور نہیں ہے۔ اس نے انشائیہ میں بقدر مردت ان کو بھی برتا ہے مگر اس طور کہ نتیجے میں تبسم زیر لب نے تبسم لیلہ ہے نہ کہ غنہ ہے بلکہ نے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو انشائیہ کا کام موضوع پر سے معین معانی کے میلے پیلے برقوں کو نوچ کر الگ کرنا تھا۔ تاکہ نئے مضامین کی آمد کا راستہ ہموار ہو سکے۔ انشائیہ آندھی، میں یہ کام انجام دینے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔

اس سلسلے میں انشائیہ کو طرز بہ اور مزاجیہ سے غیر کرنا بھی ضروری ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ طرز نگار ہمیشہ بندی پر سے نشیب پر لیک نظر ڈالتا ہے جہاں سے ناہمواریاں ہی ناہمواریاں نظر آتی ہیں۔ دراصل نشیب بجائے خود ایک ناہمواری یا طرز نگار ہے جو زمین کی ہمواری سے قطع ہونے کے باعث وجود میں آئی ہے۔ سو طرز نگار اس ناہمواری کو غنہ استہزائی میں اڑاتا ہے تاکہ سطح دوبارہ ہموار ہو جائے۔ طرز نگار کے ہاں احساس تغافل نمایاں اور بے دریغی کا جذبہ غالب ہوتا ہے وہ جس چیز سے نفرت کرتا ہے اسے بے رحم بن سے اکٹھا کر دینا چاہتا ہے تاکہ معاشرہ از سر نو صحت مند ہو سکے۔ دوسری طرف مزاج نگار نشیب میں خود کو لاکھڑا کرتا ہے یعنی خود ایک ناہمواری بن کر دوسروں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس پر نہیں۔ جس معنوں میں طرز بہ انداز غالب اور معنی کے ذریعہ اصلاح احوال مطلوب ہوتا ہے طرز بہ معنوں کہیں گے۔ دوسری طرف جس معنوں میں مزاجیہ انداز نمایاں اور آسودگی جیم ہو چکا نا مقصود نظر ہوتا ہے مزاجیہ معنوں کا نام دیں گے۔ انشائیہ ان دونوں سے مختلف چیز ہے۔ اس کا مقصد نہ تو اصلاح احوال ہے اور نہ وہ فقہاء کو کرادریوں اندر کی حاصل انجام کو خارج کر کے آپ کو آسودگی یا *RELEF* مہیا کرنے کا مقصد ہے۔ انشائیہ اسلوب کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ انشائیہ میں انشاء کا عنصر بجائے خود اس بات پر زور ہے کہ انشائیہ اسلوب کی نانگی پر زور دینا چاہتا ہے اور اس کام کے لئے وہ مزاج اور اس کے امثال کے علاوہ نشیب، استعارہ، نیز اس سارے مواد کو بقدر ضرورت استعمال کرتا ہے جو اچھی ادبی اثر کا معیاری وصف ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ انگلستان میں انگریز زبان کی لطیف ترین کردوئوں اور کہانیوں سے طلباء کو آستنا کرنے کے لئے لائٹ ایسے یا انشائیہ کو بطور خاص نصاب میں شامل کرنے کی روش عام ہے۔ آج سے چند برس پہلے جہاں یہاں ایف۔ اے کے کورس میں انشائیہ بھی شامل کرتے تھے جو ایک بہت اچھی بات تھی مگر بوجہ اس روایت کو مستحکم ہونے سے روک دیا گیا اور نصاب سے انشائیہ حذف کر دیئے گئے۔ اب جامعہ پشاور نے انشائیہ کو اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامی کر کے ایک ایسی عمدہ مثال قائم کی ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کے لئے بھی قابل تقلید ہے۔ اس جملہ مقصد کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر میں اس بات پر ہر حال زور دوں گا کہ انشائیہ وہ واحد شری صفت ہے جو زبان کی صلاحیت کا امتحان بھی ہے اور زبان کے ارتقا کا باعث بھی یہ تو ہونی اسلوب کی بات۔ مزاجیہ اور طرز بہ مضامین سے انشائیہ اسلوب کے علاوہ اپنے رویے کے بنا پر بھی مختلف ہے کیوں کہ جہاں طرز بہ معنوں ایک *RELEF* *CORRECTION* بن کر ابھرتا ہے اور مزاجیہ معنوں اعضائی تسکین بذریعہ نفسی مہیا کرتا ہے وہاں انشائیہ، شاعری اور انشاء کی طرح، جمالیاتی چکا چوند پر مبنی ہو چکا ہوتا ہے۔ شاعری یا انشاء کے ذریعے ایسا کرنا آسان ہے کیوں کہ ان میں سے اول الذکر کربلیات اور محسوسات کے جز و مدک کا سہارا لیتا ہے جب کہ شعر الذکر کہانی کے آثار پڑھاؤ کو بروئے کار لاتا ہے مگر انشائیہ نہ تو شاعری ہے اور نہ انشاء! وہ تو غیر انشائی اثر کو ادبی درجہ عطا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ کا کام "معنوں" کے پیکر کو شعر اور انشاء کے پیکر کا ہم پلہ بنانا ہے اور یہ کافی معمولی کام نہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں مختلف انشائیوں سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جو اپنے اندر چکا چوند پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یعنی قاری کو مٹی کی عام سطح سے معانی کی ایک لطیف تر سطح کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔

• موی جلفہ نسواں سے خلق رکھتی ہے۔ اس نے اس کا سارا نظام ملا دی ہے اس میں وہی صفت، قہمہ ہوگا اور ملائت ہے جو ملاطفت

فرائین میں پائی جاتی ہے اس کے برعکس سرماکسلا نظام بندی ہے یہ باپ کی طرح قدم قدم پر آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے آپ جب ذرا اس کے وجود سے محو نظر کرتے ہیں تو یہ آپ کو ڈانٹ پلاتا ہے اور کبھی کبھی ایسا سلوک کرتا ہے کہ سردی کا سارا تعلق اور مادہ راز شغف یاد آ جاتی ہے۔ (سردی)

”خود ایک تیزابی طوفان کی طرح ہے جو سیلاب کی طرح آتا ہے اور پرامن گرد و پیش کو پلٹ میں لے لیتا ہے اس کے برعکس خاصوٹی اگرچی کھوشبو کی طرح ہے جو خود بخود ہی ٹپکنے لگتی ہے۔ (خود)

”ہوا پر کمرہ ارض ایک طویل و درمیان پلٹ فائرم ہی تو ہے جسے ہی نوع انسان نے انوکھے رنگوں، رسیلی زبانوں، خوبصورت نسلوں اور دکھنٹھا فتوں سے مزین کیا ہوا ہے۔ زمین پر ہی کیا موقوف، یہ جانور اور لائقہ دستارے جو خلائے بیض میں معلق ہیں، انگنت پلٹ فائرم ہی تو ہیں۔ زمین سے جاندار کی طرف سفر کرنے کا عمل دراصل ایک پلٹ فائرم سے دوسرے فلیٹ فائرم پر قدم جانے ہی کا عمل ہے اگر دیکھی جائے تو ہمارے جسم مدور کھنڈے، دماغ خیالات کے لئے اور لب بولوں کے لئے پلٹ فائرم ہی کا درجہ رکھتے ہیں جہاں وہ کچھ دیر قیام کرتے ہیں، پھر رخصت ہوجاتے ہیں۔“

”خزل نے قصیدے کی پسلی سے جنم لیا ہے۔ پسلی سے پیدا ہونا اپنے اندر گہری ممنونیت رکھتا ہے۔ نہ جانے کب سے خزل بے پاری قصیدے کے قد میں تھی۔ داخل جیسے داستان کی نرم و نازک شہزادی بیت ناک دیو کے طلسم میں گرفتار ہو گئی تھی مگر یہ قید و بند زلی بات بھی شاید درست نہیں کیونکہ خزل تو قصیدہ کا آئوٹ انگ تھی۔ اس کی لائقہ دلیلیں ہی تھیں ایک پسلی تھی مگر ایک روز یہ پسلی قصیدے کے ٹھکانے سے مفوت ہو گئی۔ اس نے سوچا سبھا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہر وقت زمین بوس ہوتے چلے جائے۔“ (خزل)

”ایک ایسی گاڑی ہر لحظہ خدا بند سے ہم کلام ہوتی ہے۔ اس پر جو کچھ گزردا ہوتا ہے۔ اس پر جو کچھ گزرنے والا ہوتا ہے وہ سب کچھ باواظہر ہوتا ہی ہوتا ہے۔ محو اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جتنے ناز خیزے ہم نئی گاڑیوں کے اٹھاتے ہیں اتنے اگر پرانی گاڑیوں کے اٹھانے لگیں تو وہ مسلسل شرک پر رہیں۔ درکناسپ ہی گاڑی کا نعرہ ہے اور پرانی گاڑی کی مجبوریا انہی گاڑی تو خود ہم پر مسلط ہوتی ہے جب کہ پرانی گاڑی پر ہم خود سوار ہوتے ہیں۔ (نئی پرانی گاڑیوں)

”انسلین کتا سمجھو لاہ۔ اے انسان بھی علم نہیں کہ یہ سارا جہاں ہوشیار اور بے ساری خلق خدا، اس عدالتے باز گشت کا ایک روپ ہے جو عدالتے گن کی صورت خود دار ہوئی تھی ایک جو آج تک بے آواز ہے البتہ کسی روز یہ عدالتے باز گشت صور اسرار میں بن کر پڑے گی تو پھر شاید اسے اس کے وجود کی خبر ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ ہماری ہمار دن کی زندگی فقط ”کن“ اور ”موردہ کے درمیان وقفے کا نام ہے

کچھ واقعات (میں نے یاد کرتے ہیں)
”ان تہذیب شاہد سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انشائیہ کا مسلک آزاد دینی ہے۔ وہ شاہراہ پر سفر کرنے کو نا پسند کرتا ہے۔ ہنڈا بار بار شاہراہ کو سرک کر کے چلائی ہوئی پگڑیوں پر سفر کرنا دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے خود ہی ایک نئی گلائی ترکشا ہے۔ شاہراہ پر چلنے والی نظر لگتی ہے کہ گلائی اختیار کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے قیوم زندگی کے ”عظیم مقاصد“ سے ہٹ کر کچھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سرگوز ہو جاتا ہے۔
MAREO اور MAREO

میں سدا حاصل قائم کرنا ایک بے معنی بات ہے کیونکہ یہیں جڑ بھی انشائیہ ہے کہ لاد ہے جتنا کہ کل! اور مملکت ہے جو بھی کسی دوسرے ناولیے سے دیکھیں تو وہ غیر مملکت دکھائی دیتی ہے۔ ہم انسانوں نے اپنے تختہ کے لئے ہر طرف قاعدوں، اصولوں، عقیدوں اور نظریوں کی دیواریں اٹھا رکھی ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ مگر انشائیہ نگار کا کہنا ہے کہ اگر اب ان دیواروں میں روزن نہیں بنائیں گے تو تانہ ہوا کی کھ کے باعث آپ کا سانس رکھنے لگے گا۔ دیکھا جائے تو انشائیہ کا تہ خود ایک روزن ہے جس سے لگ کر آپ نہ صرف باہر کی تانہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ جس کے ذریعے آپ باہر کی دیرینہ وجہ کار دنیا سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ کسی شئی کو دیکھنا اے اور دھ لینے کے مترادف ہے۔ ”موجب انشائیہ نگار روزن میں سے باہر کی دنیا دیکھتا ہے تو اسے گورا اور دھ لیتا ہے یوں وہ اپنے بندے خانے سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف خود آزاد ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو آزاد بھی

حاصل کرنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے اگر کوئی صنف ادب قید و بند سے رہائی کا ایسا اچھا اختتام کر کے تو اس سے زیادہ جانتا اور صنف ادب کیا ہو سکتی ہے
 چنانچہ اسے کہ انشائیہ ایک ایسا اور فن ہے جس کا رخ باہر کے علاوہ اندر کی طرف بھی ہے۔ لہذا انشائیہ نہ صرف کائنات اکبر کی سباحت کرنے میں کامیابیت
 بلکہ کائنات اصغر کی خواہش پر بھی قادر ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے شے، شخصیت اور شاہراہ کی قید سے رہائی ملتی ہے۔

اوپر میں نے انشائیہ کو طنزیہ مزاحیہ مضامین سے نیز کہنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں چند الفاظ میں انشائیہ اور عام مضمون کے فرق کو واضح کرنے کی
 کوشش کرتا ہوں۔ عام مضمون سے میری مراد تنقید، تاریخ، سائنس یا سیاست کے موضوع پر لکھا گیا مضمون نہیں بلکہ عام سے غیر رسمی اور بظاہر غیر اہم موضوعات
 پر قلم بند کی گئی تحریر ہے۔ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے دکھانا نسبتاً آسان تھا مگر غیر رسمی موضوع پر لکھے گئے مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے
 دکھانا قدرے مشکل ہے کیونکہ دونوں کا میدان ایک ہے تاہم انداز نظر کا فرق انشا زیادہ ہے کہ دونوں کو ایک ہی زمرے میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے
 یہ تنقید اور ان کے رفقاء نے جو مضامین لکھے ان کے موضوعات تو تقریباً اسی وضع کے تھے جو انشائیہ نگار کو مربوط ہے مگر مزاجاً یہ مضامین
 ۲۵۵۸۷۵ کے تحت شمار ہو سکتے ہیں ذکر ۲۵۵۸۷۵-۲۵۵۸۸۲ کے تحت جن میں موضوع کو منطقی طور پر نہیں بلکہ تخلیقی طور پر لکھا جاتا ہے
 میں اس سلسلے میں ایک ہی موضوع پر لکھے گئے ایک ۲۵۵۸۸۷ اور ایک ۲۵۵۸۸۲-۲۵۵۸۸۷ سے جدا اقتباسات مثلاً پیش کر کے اپنی بات
 واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

منشی پریم چند نے زمانہ (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے شمارہ میں دو گالیاں کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس میں انواع و اقسام کی گالیوں کی خبریں
 پیش کر کے دشنام طرازی کی دو پاک مذمت کی تھی۔ اس مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

”اس سے بڑھ کر ہمارے قومی کینہ پن اور نامردی کا ثبوت نہیں مل سکتا کہ جن گالیوں کو سن کر ہمارے خون میں جوش آجانا چاہئے۔
 ان گالیوں کو ہم دودھ کی طرح پی جاتے ہیں۔ یہ بھی قومی زبان کی ایک برکت ہے۔ قومی ہستی دلوں کی عزت اور خودداری کا احسا
 شکر آدمیوں کو بے عزت اور بے شرم بنا دیتی ہے۔“
 ”غصہ میں ہم گالی بکیں، دل جی میں ہم گالی بکیں، گالیاباک کر زود دریافت ہم دکھائیں، گیت میں گالی ہم گائیں، زندگی کا کوئی کام ا
 سے خالی نہیں۔“

”حق تو یہ ہے کہ اچھی نیک ہمارے رہناؤں نے اس دیار عام کی بچہ کنی کرنے کے لئے مگر ہم کوشش نہیں کی..... اس امر کے اعلان
 کی ضرورت نہیں کہ گالیوں کا اثر چھوٹے اخلاق پر بہت غریب پڑتا ہے۔ گالیاں ہمارے نفس کو مشغل کرتی ہیں اور خودداری اور باسی
 عزت کا احساس دلوں سے کم کرتی ہیں جو ہم کو دوسری قوموں کی نگاہوں میں وقیع بنانے کے لئے ضروری ہے۔“

خوبیہ کہ منشی پریم چند کے اس مضمون میں سرسید کی آواز کتنی صاف اور خارج سنائی دے رہی ہے۔ پریم چند نے موضوع کا انتہائی سنجیدگی
 سے منطقی انداز میں جائزہ لیا ہے اور موضوع کے بارے میں وہ سارے حقائق پیش کر دیئے ہیں جو ہمیں پہلے سے معلوم نہیں اس پر متنازعہ کہ گالیوں کی
 بڑھ چکی کے لئے ایک پختہ قومی مضبوطی بھی سفارش کر رہی ہے۔ یہ تمام باتیں انشائیہ کے مزاج اور اس پرست کے منافی ہیں۔

منشی پریم چند نے یہ مضمون ۱۹۰۹ء میں لکھا تھا۔ اس کے تقریباً ستر برس بعد اسی موضوع پر غلام جیلانی اصفہانی نے ایک انشائیہ لکھا۔ اس
 انشائیہ سے میرے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ مضمون اور انشائیہ کا فرق واضح ہو سکے

”گالی دینے کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی گالی دے کر فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور نہ ہی طور پر ایک خوشگوار آسودگی محسوس کرتا ہے..... اوصاف
 کا کچھ اڈا درد ہو جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں بیعت اور سرور کا عالم ہوتا ہے۔ پنجاب میں جو آپ کو ہشاش بشاش منہیں پہناتا
 پیٹ اور بڑھکس مارتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں تو دراصل اس کی وجہ منہ ہار کی دھگالی ہے۔ جس پر تمام ویدا اور حکیم زور
 دیتے ہیں۔“

”گالی منفی سقیم اور کمزور ہوگی۔ گالی دینے والے کی شخصیت اتنی ہی گھٹتی گھٹتی ہوگی۔ گالی یعنی ہرقار اور پرندہ ہوگی۔ شخصیت
 میں انسانی وقار اور کشادگی ہوگی۔ چھوٹا آدمی ڈرتے ڈرتے چھوٹی سی گالی دیتا ہے اور فوٹا اپنی ذات کے درجے میں چھپ جاتا

لیکن بڑا آدمی موٹی سی گالی کی گندھینک کر اسے دل بے رحم باہر کھینچ لانا ہے۔

مکملی دینے سے جیسا کہ فرغ ملتا ہے۔ آخرت میں اسی نذر میں غنیمت مکتی ہے جب کالیوں پر نذر غنیمت گداری جائے۔ اسی لئے ایک لفظ

نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر بائبل پادک کی گنجائش رکھتا ہے۔ ۷۷

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح حجب ایک ہی موضوع کسی سنجیدہ معقول نگار کے ہاتھوں سے نکل کر ایک آزاد طبع انشائیہ نگار کے ہاتھوں میں آیا تو اسلوب انبیاء کے ساتھ ساتھ اسلوب خیال بھی تبدیل ہو گیا، حشری پر ہم چند اپنے عادت کے سلسلے میں بعد سجدہ ہیں۔ ان کی جگہ کوئی مزاح نگار جوتا تو نہایت غیر سنجیدہ ہو جاتا مگر انشائیہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کی امتداد میں جو سید پر حملہ دہی کرتا ہے۔ یہ گویا بل حرا پر حملے کا انداز ہے وہ موضوع کے ساتھ گویا کھیلتا ہے۔ ایک ہی وقت میں موضوع کی نامور اور کبھی نشان زد کرتا ہے اور اس کے گھر سے معاف ہم کو بھی۔ غلام جیلانی نے اصفرنے اپنے انشائیہ نگاری دینا، میں ہی اندازنا اختیار کیا ہے۔ جہاں حجب ہم انشائیہ پر حملہ چلتے ہیں تو کامیابی کی قابل مذمت بالائی سطح اور اس کے محکم نظام کے ساتھ ساتھ ہم ہراس کے گھر سے مطالب اور نئے بہت بھی حیاں ہونے لگتے ہیں۔ یوں ہم گالی کے روشن پہلوئی تک رسائی یا کر اپنے پیش پا افتادہ روایتی، اصلاحی اور اخلاقی انداز نظر پر غور کرنے لگتے ہیں۔ انشائیہ بننے ہنسانے کے عمل پائند و نصائح کے کاروبار سے آگے کی چیز ہے۔ جو انسان نکر و عمل کو ایک نئے زاویے سے دیکھتی اور نتیجہ ہمیں آگاہی کے ارفع مدارج تک لے جانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

اردو میں معنوں نگاری کا آغاز کرنے والوں میں موسیٰ احمد خان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے مگر خود موسیٰ احمد اس سلسلے میں مغرب کی معنوں نگاری سے متاثر تھے۔ موسیٰ احمد کے زمانے کی مغربی ادبیات میں معنوں نگاری نے تین واضح صورتیں اختیار کر رکھی تھیں۔ ایک صورت توصلی اور معنائی یا اصطلاحی مضامین کی تھی، دوسری طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی اور تیسری لائٹ ایسے کی جس میں معنوں نگار نے فیہر اضافہ نوئی شکر کو ادب کی سطح تعویض کر دی تھی۔ موسیٰ احمد نے ان میں سے تھیں اور اصطلاحی طرز کو اردو میں رائج کیا اور جہاں غیر رسمی موضوعات پر لکھا ریخا ل کیا وہاں بھی زیادہ تر منطقی انداز ہی کو اپنایا۔ لہذا انہیں ہم اردو میں لائٹ ایسے یعنی انشائیہ کا موسیٰ احمد یا علم بردار نہیں کہہ سکتے۔ تاہم اردو شکر کے فردن کے سلسلے میں موسیٰ احمد کے علاوے انکار ممکن نہیں ہے۔ آج اگر اردو شکر نے اپنے فنڈ طبعی، سائنسی اور تنقیدی نظریات کو پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے تو یہ موسیٰ احمد کی اولین مساعی ہی کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف طنزیہ مزاحیہ مضامین کو اردو میں مبالغہ دینے کے ضمن میں زیادہ اہمیت اردو سچ اور اس کے موازن میں کو حاصل ہے۔ جو اس میں بھی کوئی کلام انہیں کر ان لوگوں نے زیادہ تر جھگڑا پن اور عجیب انداز ہی کو فروغ دیا۔ بعد ازاں اردو میں طنز لطیف اور ہمدرد اور مزاح ایک مثالی انداز میں سکون حاصل ہوا۔ اردو یہ سلسلہ جس میں فرحت اللہ بیگ، ملک پیا، رشید احمد صدیقی، پطرس، کشمیا لال پورہ اور امینا زلی تاج سے لے کر مشتاق احمد بوسنی تک صاف دکھائی دیتا ہے۔ معنوں نگاری کی ان دونوں صورتوں کے بین بین خاص انشائیہ کی روش تھی جسے بعض اہل فن خود بخود پر اپنا سنے کی کوشش تو کی مگر شاید ابھی فدیہ انہما یعنی اردو شکر اس سطح پر نہیں پہنچے پائی تھی کہ انشائیہ کے لطیف نکات کو گرفت میں لے سکتی یا شاید خود لکھنے والوں کے ہاں دھوا انشائیہ کا مزاج واضح نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے مضامین میں یہاں وہاں انشائیہ لکھنے تو پیدا کئے مگر کوئی مکمل انشائیہ لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں بہت سے نام گننے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض کرم فروماؤں نے ملا و تھی کو بھی نہیں بخشا اور اس کی کٹی چٹی تر پیر بھی انشائیہ کا شتہ لگا دیا ہے۔ دیگر جن لکھنے والوں کے نام لے گئے ہیں ان میں محمد حسین اللہ، مولوی خیر محمد دہلوی، الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، رتن ناتھ سرشار، وحید الدین سلیم، محمد اکھیم شرر اور ان کے بعد نیا زنجویری، شیخ عبدالقادر مہدی، طاہری، ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری، سجاد سید ریلدہم، فخر حسن نظامی، ابو الکلام آزاد اور بعض دیگر اکابرین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مگر دیکھا جائے تو ان لکھنے والوں میں بھی ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری اور فخر حسن نظامی اور ابو الکلام آزاد ہی بالخصوص ہیں۔ تب تک جس انشائیہ کے مخصوص مزاج اور انداز کی طرف پیش قدمی کے شواہد ملتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو انشائیہ نگار بننے سے رو گئے۔ وجہ وہی تھیں جن کا میں نے ابھی بھی ذکر کیا۔

ایک بات کا ذکر کر دوں۔ یادو باجن کا جھکاؤ لائٹ ایسے کی طرف تھا، انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ غیر خودی طور پر کس سہنری پٹریا کو زیرِ مام لانے کے منتفی ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے وجود میں آنے سے ذرا قبل کرشن چندر، منگل پتا اور رشید احمد صدیقی اجماعے بن کے ہاں بھی منشاءِ نوینی کا رجحان شعوری سطح پر موجود نہیں تھا۔ گو ان کے مضامین میں انشائی عناصر قیداً موجود تھے۔ اسی زمانے میں اختر اور نوئی وہ پہلا ادیب تھا جس نے گوگوں کو شعوری طور پر لائٹ ایسے کے مزاج سے آشنا کرنے کی کوشش کی، اختر اور نوئی نے

علی اگر تاحمد کے مضامین کے قلمی اور لکھنے پر توجہ کرے گا اس میں پہلی بار نہ صرف لائٹ ایسے کے مقدمات کے بارے میں کھل کر کھل کر لائٹ ایسے کے لئے انشائیہ کا لفظ بھی استعمال کیا مگر جن مضامین (یعنی علی تاحمد کے مضامین) پر اس نے لفظ انشائیہ، چھپا کر اس کے کوشش کی وہ عام سے طنز مزاحیہ مضامین تھے جن کا انشائیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انفرادی طور پر انشائیہ کے مقدمات کو پیش کرنے پر توجہ درجہ تھا۔ لیکن انشائیہ کو چھپانے میں کامیاب نہ ہوا۔ اسی لئے اس کا تجربہ کر کے لفظ انشائیہ، بھی اس زمانے میں مقبول نہ ہو سکا۔

تقسیم نوآباد (یا خصوص پاکستان میں) انشائیہ نویسی کا رجحان اپنے واضح خدوخال کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس زمانے میں بغیر آغا، داؤد مراد، جوادیل صدیقی، ممتاز شفیق اور احمد صہب کے ایسے مضامین سامنے آئے جن میں اسے بعض انشائیہ کے اولین نمونے تھے۔ گو ان ادبا کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ صرف انشائیہ میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ دراصل یہ لوگ اپنی ترمیم کے انداز و تجربات اور تعلقات کو لاپرواہ کر دیتے تھے مگر اس کی بجائے ان کے ہاں جو تحریریں جنم لے رہی تھیں وہ مغرب کی مقبول صنف ادب یعنی لائٹ ایسے یا انشائیہ کے زمرے میں شامل تھیں۔ خود داؤد کو صرف اس بات کا اعتراف ہے کہ نصیر آغا کے نام سے اس کا جو پہلا انشائیہ، وہ ادبی دنیا میں چھپا تھا وہ بطور انشائیہ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ البتہ اس کے تین چار برس بعد قیوم نظر کے ایسا پر اس نے شعوری طور پر ایک انشائیہ بعنوان گرمی، لکھا اور اس میں سے پاکستان میں انشائیہ نگاری کی ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔ دیکھیں بات یہ ہے کہ گو داؤد کو صرف اس بات کا علم تھا کہ وہ لائٹ ایسے لکھنے کا کوشش کر رہا ہے لیکن اس کے لئے کوئی موضوع متبادل اردو لفظ بھی اسے موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آغاز کار میں یہ لفظ ایسے، لائٹ ایسے، لطف پارہ وغیرہ الفاظ اور ترکیب رائج کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اپنی دنوں ہندوستان میں نکلی ہی مضامین کے لئے بعض ادبا نے انشائیہ کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ داؤد کو صرف نے اس لطیف کی غماز سے اس لفظ کو لائٹ ایسے کے لئے استعمال کرنے کا آغاز کیا اور خوش قسمتی یہ ہوئی کہ نہ صرف اردو انشائیہ کی تحریک کامیاب ہوئی بلکہ اس کے ساتھ میں لفظ انشائیہ بھی مقبول ہو گیا۔

اردو انشائیہ نگاری کی پہلی کھپ میں مشکور صہب، باد، مشتاق قمر، جمیل آذر، داؤد غلام جیلانی اصرار تھے۔ ان میں سے مشکور صہب یا داؤد انشائیہ شناس تو تھے مگر ایک نوجوان اصلاحی رویے کی قدیم روایت کے تابع تھے۔ دوسرے ان کے ہاں منطقی انداز و تسلسل تھا۔ مگر دوسرے انشائیہ نگاروں یا خصوص مشتاق قمر مرحوم، جمیل آذر، غلام جیلانی، صفر، انور سدید، کامل انصاری، تقی حسین، احمد جیل پاشا، اکبر سعیدی، سلیم آغا قریب، انور شمس، جوشنگ لکھے وہ لائٹ ایسے کے معیار پرورد اترتے تھے۔ ان کے بعد لکھنے والوں کی ایک اور کھپ سامنے آئی جس میں رام لعل، ناجی، محمد سار، عید قریبی، جوشنگ حیدر، ملک، باجم نیازی، بشیر سیفی، بیان کا شیری، شمیم ترمذی، محمد اقبال، نجم، خالد پرویز، صدیقی، حفیظ، باؤ، خیر الدین، انصاری، محمد یونس، بٹ، مشتاق احمد، ناصر عباس، نیر اور دیگر بہت سے انشائیہ نگار تھے جنہوں نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی اور کر رہے ہیں۔ آج اردو انشائیہ اپنے عروج پر ہے اور ہر چند کہ اس تحریک کو اردو ادب کا جزو بدن بنے۔ ابھی چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوا تاہم اس قلیل مدت میں بھی اس کے طفیل متعدد ایسے اعلیٰ پائے کے انشائیہ وجود میں آئے جنہیں ہم کامل اعتماد کے ساتھ مغرب کے بہترین لائٹ ایسے کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ اردو انشائیہ کی کامیابی کا اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ انشائیہ کے صنف کے خلاف باجموں اور اردو انشائیہ کے خلاف باخصوص ایک اخباری ہم چلائی گئی ہے جو اب اردو کے بعض سرکاری ادبی جریلوں میں بھی نظر آنے لگی ہے۔ کسی بھی صنف ادب کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہئے کہ اس کے خلاف رد عمل کی شدت کس قدر ہے۔ انشائیہ اور اردو انشائیہ نے جو شدید رد عمل پیدا کیا ہے وہ اب سامنے کی بات ہے تاہم اس رد عمل میں صفر نفیس یا غفر کی زیریں لہر کا احساس ابھی زیادہ لوگوں کو نہیں ہے۔ مگر وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب رد عمل کا یہ طوفانی پہلو قاری پر عیاں ہو جائے گا۔ جب ایسا ہو تو اردو انشائیہ کے فروغ کے راستے میں آخری رکاوٹ بھی باقی نہیں رہے گی۔ ❀



رحمن جانی

مرقعے

[مرقع : ۲۲ مائراؤں پر مشتمل ایک نئی صفت
اپنا ایک ایچ ہے
دنیا ایک ایچ ہے، جس کا نقشہ گول
اگر تو گنھا گئے، اپنا اپنا رول
کہیں کہیں ہے قبول



مہدی پریا بگدی

کبھی تو وہم سے گزرے، کبھی گماں میں رہے
تمام عمر ہم اک سخت امتحاں میں رہے



خلیل تنویر

وہ ملا بھی تو اس سے کیا کہتے
بڑھ چلے تھے ہوا سے دل کے

وہ بھی اک سایہ گرہاں تھا
ہم بے کائنات تھے

پھر لہو میں دھواں سا امتحان ہے
یاد آتے ہیں قافلے گل کے

پیری آمد کی منتظر آنکھیں
تجھ گئیں خاک ہو گئے رستے

پاس لگتی تھی دور کی آواز
یہ گزشتے بھی رات بھر کے تھے

● گورنمنٹ میوزیم، محلہ سے پور۔ راجستان

● میں میں ہوں تو تو نہیں
اب کوئی سا ہو نہیں، ہر کوئی ہے پور
دنیا ہے تجھے مرے، بھاگوں اب اس دور
بندھی ہوئی ہے دور

● غم سنے گی آنکھیں
کیا سنے گی آنکھیں، کیا اس کی اوقات
تجھے گا میرا جنوں، اس دنیا کے ساتھ
بدلیں گے حالات

● جام خوشی کا بھر چکو
جو کرنا ہے کر چکو، اپنا اپنا کاج
جائی ورنہ آک، وقت نہیں محتاج
کل کی کر لو کاج

● ۱۲-۲-۸۳۰/۱۳-۱۳-۱۳۳۰
مہدی پنجم، حیدر آباد ۱۵

● ضرورتوں کے تحت رابطہ تھا دنیا سے
مسافروں کی طرح ہم بھرے جہاں میں رہے
میں ایسا سچ کہ جگہ جس کو عاشرے پہ ملنی
وہ جھوٹے لفظ تھے صفوں کے درمیان میں رہے

● ابھی سلوک کی منزل بھی طے نہ ہو پائی
ابھی تلک تو ہم اک سخی راہیگاں میں رہے

● ہمارا نام ہمیشہ ہی سرخسوں میں رہا
ستارہ بن کے چین شربت گراں میں رہے

● کہاں زمین پہ ٹھہرتے ہیں آدمی کے قدم
ہر آن ایک تہہ در تہہ آسماں میں رہے

● ۲۸- اسکول وارڈ پریا بگدی - ۱۳۳۰



فیوم رات

کئی ہلاک، لے۔۔۔ سو تازہ تازہ آباد، (۱۹۹۰ء - ۲۰۰۰ء) (پاکستان)

دسترس

اور موجودہ آمدنی میں تو زندگی کی بیشتر خوشیوں سے محروم رہنے کے باوجود بمشکل گزارہ ہوتا ہے اور تم ہو کہ شادی کے نئے مسلسل اصرار کے سوا ہی ہو اور یہاں اب حالت یہ ہے کہ محمدی اور کم مائیگی کے احساس نے میرے وجود کو خود اپنی نظروں میں بے معنی اور بے وقعت بنا دیا ہے جیسے کوئی انتہائی بے کار اور حقیر شخص ہے۔

اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا، چور اے کو بار کر کے وہ قہوڑی دوڑا اور بس اسٹاپ کے پاس رک گیا۔ مکان کے باعث اس نے فیصلہ کیا کہ پیدل نہیں جائے گا بس کا انتظار کرے گا۔

قہوڑی دوڑا ایک گھنٹے درخت کے نیچے کھٹی رنگ کے برقعے میں ایک عورت ادھر ادھر تک جا رہی تھی۔ گویا اسے کسی کا انتظار ہو۔ ایک نوجوان اس کو بغور دیکھتا ہوا آگے چلا گیا۔ چونہ گز کا نام نہ کرنے کے بعد وہ پھر لوٹا اور عورت کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا کچھ باتیں ہوئیں اور نوجوان نے اپنی راہ لی۔

کبھی وہ بھی لاابالی ہو کر رہتا تھا۔ اس میں بھی زندگی کی لگن تھی۔ وہ بھی شہر کے ایسے بازاریوں میں گھومنا کرتا تھا۔ جہاں پر رنگ برنگے ملبوسات کے جلوں سے پناہ حسن کے جلوے اس کی نگاہوں کا مرکز بن رہے تھے۔ اجاب کے ساتھ تو وہ بس بھی کبھی ہی گپ شپ طرانا تھا ورنہ بیشتر اوقات وہ تنہا رہتا تھا۔ تنہائی میں اس کو ایک آزادی کا احساس ہوتا تھا۔ اس وجہ سے گھومتا، پھرنا ہو یا پھر دیکھنا یا کوئی اور سیر و تفریح، ہر سیر گرام میں وہ تنہائی کو ترجیح دیتا تھا۔ کبھی شہر کے چٹاؤ سے دل اچاٹ ہو جاتا تو مصافحات میں کھیتوں کی طرف نکلے جاتا، رنگ برنگے پھول، تازہ تازہ ہیرا، مسکرتے دھنوں

پھر باؤس میں سے انٹوں کا ایک جھوم امد کر باہر آیا۔ وہ سب سے نیچے تھا، اکیلا، سست رو، کھلایا کھلایا سا گویا پھر دیکھنے کے بجائے وہ کسی جنازے کو کا ندھا دے کر آیا ہو وہ خود بھی تو ایک چلتی پھرتی ماشین کر رہ گیا تھا۔ نہ کوئی اسٹنگ، نہ کوئی ہسٹ، نہ کوئی آس، ایک دن بس یوں کسوس ہوا تھا جیسے چلتی گاڑی بکھلتی رک گئی ہو۔

گیٹ سے باہر آکر اس نے سگریٹ سلگایا۔ یوں ہی ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا اب کدھر جائے۔ کیسی کیسی دل چسپیوں اور رنگینیوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ وہ جن کے حصول کے لئے نہ کسی ٹنگ و دوک ضرورت پڑتی تھی اور نہ ہی اس کی جیب پر کوئی بار پڑتا تھا اور کتنے ہی عرصے وہ اس گور کے گرد چکر لگانے میں مشغول رہا تھا۔ لیکن اب تو تمام مہارے بے جا ہو کر رہ گئے تھے۔ سارے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ پھیکے ہندم اور اداس۔

دھیرے دھیرے وہ اس سڑک کی جانب چل پڑا جہاں پر امد و رفت بہت کم تھی۔ ایک خوبصورت جوڑا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اس کے نزدیک سے گزرا۔

ماں۔ اگر میں صاف صاف بتا دوں تو تم نڈھال ہو جاؤ گی۔ تم کھتی ہو کہ میں بدل گیا ہوں۔ مجھے اس بڑے شہر کی بوائے گئی ہے نہیں اپنے بیٹے کے بارے میں بھی کچھ پوچھنا چاہیے جو تم سوچ رہی ہو۔ لیکن ماں تم اگر کبھی یہاں آؤ اور دیکھو کہ تمہارا بیٹا ایک چھوٹے سے کمرے میں کس قدر بے کیف زندگی گزار رہا ہے۔ تو میں اپنا دم گھٹاتا ہوا محسوس ہونے لگا

بس آپ ہی آپ اس کی نیند بھاٹ ہو جاتی تھی اور وہ دیر تک
کروڑوں پر کروڑیں بدلتا رہتا تھا۔

یہ ایک روشنی بکھ گئی اور کچھا بند ہو گیا وہ بدستور لٹا ہوا
حالانکہ گرمی سے اس کا ہر حال ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں اے کیا ہو گیا
تھا۔ ایسا تو بے حس وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی سی دیر
میں وہ پیسے میں شہر آباد ہو گیا۔

پھر جلد ہی روشنی آگئی اور کچھا پلنے لگا اور بے لے پٹکے
کی ہوا واقعی خوشگوار محسوس ہوئی۔ پہلے تو صرف ہوا تھی جو پٹکے
سے آ رہی تھی لیکن اب کتنی فرصت بخش ہو گئی تھی یہ ہوا۔ اس
نے سوچا اور اس کے انگ انگ میں ایک تازگی سرایت کر گئی۔

پہلے فک ہوئے ہی اس کا ذہن ایک انوکھے خیال کی آماجگاہ بن
گیا۔ کیوں نہ وہ سگریٹ نوشی ترک کر دے۔ یہ بات تو اس
کے بس میں ہے۔ کتنا غیر متوقع اور عجیب تھا یہ خیال۔ اس کی
طبیعت میں ایک ابال سا اٹھا اس خیال نے اس کے ذہن
کے کینوس پر ایک نیا رنگ انڈیل دیا۔

دفعتاً وہ ایک جوش کے ساتھ اٹھا۔ جلتا ہوا سگریٹ ہیں
نے جوتے سے مل کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور فرش پر پڑے دی
پھر اس نے دایا پاؤں ڈبیا کو کپکنے کے لئے اوپر کو اٹھانا چاہا
لیکن اسی لمحے اسے خیال آیا کہ اس میں ابھی نو سگریٹ موجود ہیں
خامے پیسوں کا نقصان ہو گا۔ اور اگر چند دنوں کے بعد
اسے پھر سگریٹ پینا پڑا تو۔۔۔ کتنا لطف آئے گا اس وقت
اور تب پاؤں کے بجائے اس کا ہاتھ سگریٹ کی ڈبیا کی طرف
بڑھا بڑی چاہ اور جذباتی انداز میں۔ اس نے سگریٹ کی
ڈبیا اٹھائی اور آنے والے دنوں میں سگریٹ نوشی کی لذت
کے خیال سے وہ ایسا سرشار ہوا کہ بے ساختہ ٹوٹنے سے سیٹی بھرنے
لگا۔

ایک دم سگریٹ کی ڈبیا اس نے اندری میں رکھی ہوئی اشیاء
کے نیچے چھادی پھر نیل میپ اور نیچے کی سوچے آنے کے اور لٹا کر
کو مقل کر کے سیٹی بجاتا ہوا اپنے ہونٹ کی جانب چل پڑا۔
آج بہت دنوں کے بعد اسے بھوک کا شدید احساس ہو رہا
تھا۔ ❀

کی اوٹ میں غروب ہوتا ہوا سورج، گرد و پیش میں اٹلی،
چھوکتی ہوئی چڑیوں کی چہرے۔ کچھ دیر کے لئے وہ بالکل
میں جذب سا ہو جاتا۔

مگر اب تو کوئی خواہش بکھڑ رہی ہو جیسے۔ کسی شے اور
کسی بات میں کوئی کشش ہی نہ رہی تھی۔ سب کچھ بے معنی اور
بے مقصد ہو کر رہ گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ بھوئی بھوئی خوشیوں
اور مصحوم مسرتوں کے جگڑوں میں روپوش ہو گئے تھے۔

ایک کار شور مچائی ہوئی تیزی سے اس کے سامنے سے
گزر رہی تو اسے احساس ہوا کہ وہ بس اسٹینڈ پر کھڑا ہے

اس نے تیسرا سگریٹ سٹکایا۔ اور خالی ڈبیا ایک
طرف پھینک دی۔

عورت ایک نوجوان کے اسکوٹر پر بیٹھ چکی تھی۔

اسکوٹر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو اس نے سگریٹ
کے کئی بے لے کش لئے۔ پھر پینڈ گز کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے
ٹوٹنے والے سے سگریٹ کی ڈبیا خریدی۔ اور اپنی جگہ آکر
کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ٹیبل میپ اور پٹکے
کے سوچے آن کر دیئے اور پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر
تک آنکھیں پپے خال اندھن سا لٹا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں
تو میز پر پڑا ہوا رسالہ اس کی توجہ کا مرکز بنا۔ یہ رسالہ کئی دن
ہوئے اس کے دوست نے پڑھنے کے لئے دیا تھا۔ وہ ابھی
تک ایک بھی افسانہ پڑھ نہیں سکا تھا۔ حالانکہ مطالعہ اس کا
محبوب مشغلہ تھا۔ کتنی بار اس نے یہ رسالہ اٹھایا تھا۔

بے نہر تپ سے چند سطروں پڑھی تھیں اور بے دل کے ساتھ
بند کر کے رکھ دیا تھا۔

سگریٹ سٹک کر اس نے ماچس اور سگریٹ کی ڈبیا
ٹیکے کے قریب رکھ دی۔

جب سے اس کی یہ عجیب حالت ہوئی تھی اس کے سگریٹ
پینے کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آدھی
آدھی رات تک جاگن اور سگریٹ پر سگریٹ چھوٹکتا رہتا
اس کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ دیر جاگنے کے لئے
سگریٹ پنا رہا ہے یا سگریٹ پینے کے لئے جاگ رہا ہے۔

غزل

ختم شمیم



سین کا ف لظام



منزل کا نشان کب دے گا
آہ کو آسمان کب دے گا

عظمتوں کا نشان کب دے گا
میرے حق میں بیان کب دے گا

ظلم تو بے زبان ہے لیکن
زخم کو تو زبان کب دے گا

موت مایوس ہوتی جاتی ہے
دینے والے توجان کب دے گا

ڈوبتا ہے سفینہ سینوں کا
نوح سا نگہبان کب دے گا

مجھ کو جنگل دیا ہے جینے کو
بزدلوں کو حجام کب دے گا

بس یہی پوچھنا ہے اس لظام
پر دیے ہیں اُن کا کب دے گا

زندگ کو آئینہ رشک ہنر کرنا ہے
اے مری خوش نظری! یوں بھی بسر کرنا ہے

دعویٰ کو سایہ تو صحران کو شجر کرنا ہے
زندگی ہے تو سراپوں کا سفر کرنا ہے

نقش بھی دہم میں گم رُس کو ہنر کرنا ہے
حیرت آئینہ کو خود یہ نظر کرنا ہے

”بوئے گل، نازِ دل، دودِ چراغِ محفل“

ایک ہی سمت میں ہم سب کو سفر کرنا ہے

تیری خاطر اے شبِ بھر و تری عمر دراز

ہنسی میٹائی یہ رک داغِ سحر کرنا ہے

اسی ویرانِ خرابہ کو بسانا ہے شمیم

سُتِ جاں کو اسی دشت میں گھر کرنا ہے

ایک ہی سمت میں ہم سب کو سفر کرنا ہے

۱۰۰ - ۱۰۱ - ۱۰۲

۲۲ منہ ابوالحسن

عزیز کا دل دروڈ پارکس، کٹر باغی، ملک کی دہلی

گیت

رات کی ڈر منگ ٹوٹتے تے تابش کو داپس آنا تھا۔ مگر وہ نہیں آیا
تھینے تھوڑی دیر تک نگر مند ہی پھر وہ پاس دلی کوٹھی میں جا کر بہم خانہ کی
کی اجازت سے اس نے ایر پورٹ کے بیرونی کمرے اور یہ معلوم ہو جانے پر
کہ مصلوبہ قلابیت بخیر خود اپنے بھی وقت پر پہنچ چکی ہے بہم خانہ کا
شکر کہ لدا کے داپس اپنے گھر پر آگئی۔

اس کے دوڑوں کے کھانا کھا کر سو چکے تھے لہذا خود بھی بستر پر
دراز ہو کر لیٹ گئے۔ تھینے نے سوچا تاہم اس کے لک جانے کی جیتنا کوئی خاص
وجہ نہ ہوگی۔ درحسب دعوہ وہ آج ضرور آجائے۔ یہ یقین اب اس کے مذہبی
عقیدے میں سے آئے گا۔

بڑی خواہش تھی اس کی کہ وہ بھی کبھی ہوائی سفر کرے مگر اب تک
نہیں کر سکی تھی کیونکہ تابش جب کبھی سرکاری ڈر پر لگتی جاتا تھا تو سرکاری
خزانے سے ہی ہانا تھا خود اپنی من سے اتنے دام خرچ نہیں کر سکتا تھا۔
حالانکہ اپنی آمدنی پر چھانسنے کے یہ بھی جان سے خواہشمند تھا۔ مگر ازل تو
اسے ملازمت کے بجز دوسرے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ دم اس کے
پاس نہ تھا نہ ہی نہیں تھا کہ جس کے بل بوتے پر وہ اپنا کوئی مختصر عرصہ بھی
ذائقہ کا انداز شروع کر سکتا۔ اور اس کی نگرانی کے لئے وقت میں نکال سکتا
لہذا ان دونوں میں اس کی بابت سوچا ہی ترک کر دیا تھا کیونکہ
مصلوبہ کو سچے سے کہ نہیں ہوتا چنانچہ مدت ہوئی وہ دونوں ہی اپنے اپنے خزانوں پر
مخبروں کو چمک چمک کر لاپچھے تھے اور لہذا ترو کی بندگی کی بجائی تھی
بہ کیفیت زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

تابش کا وقت تو دوسری چیزوں میں توں کٹ ہی جاتا تھا مگر تھینے کے
لئے وقت گزرا جیسا چھانسا مصلوبہ بھی دونوں بچوں کے اس کو لک جانے
اور تابش کے اس مولد ہو جانے کے بعد وہ گھر میں باطل تیار ہو جاتی
تھی مگر وہ کام نکلنے کی ماہر تھی وہ بڑے کم وقت میں تمام کام کر لیتی تھی



چھوٹا سا تو کنبہ تھا ان کا لیکن کام کرنے کے بعد جو وقت بچ جاتا تھا وہ بڑا
پریشان کن ہوتا تھا کیونکہ تھینے کو سب سے زیادہ شوق تھا کہ کوئی اور
خاص شوق لادوس پڑوس کی باتوں خولتی ہے وہ اسے ستراتی تھی کہ
سے ان کے کسی بھی ٹاپک سے دلچسپی نہیں تھی۔ سوائے دوسروں کے
عرب و عورتوں نے انہیں شہر کرنے دوسروں کی غیبت کرنے اور خود کو
بہتر سمجھنے کے ان سب کی لانا آؤں لاد گھٹو کا کوئی اور حاصل یا مقصد
نہیں ہوتا تھا۔ اور تھینے کو غیبت سے سخت پرہیز تھی۔ ہر دن نگینوں سے
البتہ تھینے کو خاص شغف تھا۔ یا قوت، زور، کھرا، امر جان، زور
حقیقی وغیرہ کے خواہش کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھا تھا لہذا اسے
معلوم تھا کہ بصرے کا خاص صفت جاپان کا کلچر مرنے کو ملبا کا پتا برا
کا دلی اور کشمیر کا نعل اپنی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اپنی خصوصی توجہ کی
وجہ سے وہ بھی جانتی تھی کہ مشہور نانہ کوہ نور میرے کا ذہن ایک تھوڑا
رہتی ہے اور ہندوستان، بلوچستان اور امرائیل میرے ترانے دلے مالک ہیں۔
کاش کہ وہ کبھی قریب سے میری نگینوں کو دیکھ سکتی چند منٹ کے لئے
ہی سبھی انہیں ان کی غفلت سے اٹھا کر اپنی اہمیت پر سمجھانے کا فرار اور
ان کا دل خوش کسی مس محسوس کر سکتی؟ اپنی آنکھوں میں ان کی حقیقی تھیں
چھوٹا سا سما سکتی؟ مگر یہ بھی ایک خواب نا ممکن تھا۔ شاید کبھی پورانا ہوئے
والا اسے تسلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ پھر جبراً انہیں ان کی نگین
کو پڑتی تھی۔ لہذا اشدی کے ہندو میں ہندو ہی سوائے تابش کے
سوکے وہ اور سب کے بھول جاتی تھیں۔ چر دو دو سال کے دنوں سے
دو ہفتوں کی پیدائش نے اسے دوسری تمام جڑی معروضیات سے
مزید پریشان بنا دیا۔ اور وہ صرف بچوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئی۔
جب تک کچھ سیدنا ہوئے تھے وہ اور تابش کا تہیہ مگر خوشگوار
دن گزارتے رہے تھے مگر بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ہاتھ بندر کا بڑے

جیسی کہ گذر وہ سب اہم رہے صاحب توفیق جیسی ملتے تھے۔ بانو بیک
منانے نہیں چلے جاتے یا کسی بھی فریڈ کے یہاں دنش کر لیتے۔ بشریک خود
ان کے ہاں کوئی آواز جاتا دن ان کی تقریر کا چھوٹا موٹا پروگرام بھی چوٹ
ہو کر رہ جاتا تھا۔ اور یہی وہ وجہ تھیں جن کے باعث تہینہ شدید سی
یکساںیت کا شکار تھی۔ وہ ایک اچھی بڑی اچھی ماں تھی مگر حالات کے
باتوں بری ملا۔ بے بسی کی سٹھک میں بند جبر کی ہولی تھی جس سے
نجات کا لہجہ کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ بہر حال اگلی صبح حسب عادت
غاز خیر سے نارس ہو کر وہ اپنے مقررہ کاموں میں مصروف ہو گئی اور بچوں
کو ناشہ کر کے اسکول روانہ کر دینے کے بعد تابش کے انتظار میں بیرونی
سیڑھیوں پر جا بیٹھی، آج تابش کو ابھی جانا چاہیے وہ کہنے پر ریت
سے گہرا کر سوما اور دن کی دس بجے والی ٹائٹ سے تابش دانی آگیا
گھر پہنچ کر کھانا سواری سے اترتے ہی سوٹ کیس اور ہینڈ
بگ پر چھوڑ کر کہہ کر اس نے وہیں تہینہ کے گے میں بائیس ڈال دیں
"سوری لائف بارنر کہ میں کل حسب وعدہ نہیں آسکا مگر کچ بہر حال
تمہارے آگے حاضر ہوں دیکھو" وہ چپکا تہینہ نے اپنی ٹھنڈی مائیس
ہوٹوں تک آنے سے روک کر کہہ کر تابش کی خوش دلی کو مشاعرہ نہیں
گوناچا ہوتی تھی۔ خوش دلی جو کبھی کبھی اس کے جھٹے میں آتی تھی اس نے
خود کی میٹھی پیچھے میں بولی "خوش آمدید خوش آمدید" اب فوراً یہ جلاو

کیا آج بھی آفس جاؤ گے تم؟
"ٹو ڈیل دھندلی آفس" تابش سہکتے ہوئے خلاف توقع بولا
"اگرچہ آفس جا کر اپنی واپسی اور معافی ضرور درج کر دانی ہے بے
چروٹی کم از کم آج میں آفس نہیں جاؤں گا۔ لائف بارنر اور نالے
کی یہ کاہل ان اب کل کی کڑوں کا بیج صرف تمہارے ساتھ رہوں گا۔ خوش
ہو! ایک خاک ہونا کیونکہ بھی بھر میں نا!
تہینہ کھل گئی۔

ہاں اہم سب بھیر میں تابش نے طے چیم براہ تھے تمہارے۔ آؤ اب
اند چلیں کیا یہی سیڑھیوں پر ہی تمام گفتگو ختم کر لو گے؟
تہینہ نے لائٹ سے تابش کی بائیں خود سے الگ کیس اور
تابش کا سفری سامان تمام گھر میں داخل ہو گئی۔ تابش بھی ان کے
ہلو ہلو اندر پہنچا۔ اندر پہنچ کر بے تالی سے ہنڈ بگ کوٹے پر سے
بولا "یہ دیکھو کیا لایا ہوں میں تمہارے لئے" اور صندوق کی کھڑکی
سے ہنڈ بگ بولی ایک دیدہ زیب نقشہ صندوقچی نکال کر تہینہ

بڑھتے ہوئے افواہات نے انہیں رفتہ رفتہ معاشی پس ماندگی کا شکار
کو دیکھ کر نہ وہ کسی ایک کیرئیر سے تعلق رکھتی تھی نہ ہی تائش بلکہ وہ سب
متوسط طبقے کے ایسے افراد تھے جن کی سفید پوش کا انحصار صرف اندرون
ان کی محنت اور کاوشوں پر منحصر تھا۔

تابش کا خاندان قراب بھی اپنی باپانی کا دوسری کھیت کھیاؤں
کی دیکھ بھال اور حفاظت میں مصروف تھا تابش کو چونکہ دیہی زندگی سے
کوئی دلچسپی نہیں تھی اس نے پہلے حصول تعلیم کے لئے اور پھر ملازمت
کے لئے وہ شہر میں ہی رہ گیا تھا شہر میں ہی اس نے تہینہ سے شادی
کر لی تھی۔ اور وہ دونوں ہی اگرچہ کہ بہت خوش حال کال کال تھے مگر تائش
کے والدین جو کہ ان کی شادی سے خوش نہ تھے اس لئے تابش سے
ان کے مراسم بھی برائے نام رہ گئے تھے۔ تہینہ کے والدین نے تہینہ
کی خوشی کا خاطر البتہ تابش کو غنہ پیشانی سے سے قبول کر لیا تھا
ان کے جانی بہن اکثر اس سے ملنے آ جاتے تھے اور وہ خود بھی وقتاً
وقتاً اپنے والدین کے پاس حاصل کرنے اپنے لٹیکے چلی جاتی تھی مگر
یہ ایسی باتیں نہیں تھیں جس سے تہینہ کی مستقل تنہائی بھلی رہتا۔
چنانچہ مدت بعد جب بچے مکمل جانے لگے تو وہ گھر سوار نے سجانے
کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ اپنے گھر کو کوئی عشرت کہہ نہیں سنا چاہتی تھی مگر ہر روز
بشریک طرح بہتر زندگی کی آرزو ان کی بھی عین تھی۔ لہذا وہ ایسا
ضرور بنانا چاہتی تھی جس کی ہر ایک چیز جاذب نظر جاذب توجہ ہو سکی
تابش کی کم آمدنی کی وجہ سے وہ اپنی یہ خواہش بھی پوری نہیں کر پڑ
رہی تھی لہذا ممکنہ رد و بدل کے بعد ہر ماہ پر ہر ماہ بڑھتی گئی تھی۔ ایسے
میں اسے اپنی زندگی کا صرف وہی عرصہ بھلا لگتا تھا جب تابش ان
کے ساتھ جوتا تھا۔ کہ جس طرح سونے پر جا ہوا میل سہاگے سے صاف ہو
جاتا ہے۔ اسی طرح تہینہ کا وجود بھی تابش کی وفات میں چلنے دھکنے لو
دینے لگتا تھا۔ گریس عرصہ بڑا تیل جوتا تھا۔ تابش دھڑی اور میں
ملے ملے دھندلا رہتا تھا۔ اور اکثر و بیشتر سرکاری ٹنڈ کے سلسلے میں
ہفتہ ہفتہ بھر بیرون شہر بھی چلا جاتا تھا پھر ٹھک تھا کہ آتا تو خوش
دل اور فراغت کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا تھا کیونکہ
اگلی صبح اسے پھر مقررہ وقت پر آفس جانا ہوتا تھا۔ جی تو اس کا بھلا تھا
جا رہا ہو گا مگر اطمینان و فراغت سے لطف زندگی سے میرا ہونے
مگر بیش زندگی کے لئے اس قابل ہی نہیں رکھا تھا ہفتے بھر میں صرف

کو گمان نہ۔

”کیسے ہے؟“ اسی میں اپنے زیورات رکھ سکتی ہوں؟

بہت عمدہ بہت غنیمت ہے تابش۔

”تھوڑے مسند جی کے نقش و نگار پر زری سے انگلیاں دھرنے ہوئے ہوں پھر شک جی۔ زیورات؟“

تابش بھی اپنی بھل پر گڑبڑا گیا۔ پھر منہ پر ہلا ہوا زیورات کو اگر کبھی زندگی نے حرکت دیا تو زیورات سے لادوں کا تھیں یہی فی الحال تم اس میں اپنا آرائشی سامان تو رکھ ہی سکتی ہو نہ؟

اور ہمیں کون تو زیورات سے ہٹانے کے لیے اس نے دوبارہ

ہینڈ بیگ میں باقہ ڈال کر چند غریبوں پر لڑکیوں اور ہینڈ بیگ کی ٹپ ہٹ کر کے وہ چیزیں میں ہمیں کے حملے کر دیں۔ دیکھو ذرا ایسے ہیں۔ یہ کھوئے؟ اپنے بچوں کو پسند تو آئیں گے نا تمہیں؟

”بے شک۔“ ہم نے لپٹے ہاتھ میں دھبے کھوڑوں کو بھروسہ دیکھتے ہوئے کہا کہ کھوٹے واقعی بڑھاتے۔

”جان ملٹی اندھا قاتل۔ لالک پارٹر منگے پناہ نہ عمارت تابش پھر چلا۔ اور اس کی بے پناہ شاعری کی طرح غریب ہر وقت میرے حواس پر چھال رہی ہو۔ خواہ میرے سامنے رہو نہ رہو۔

وہ بستر پر بیٹھ کر جتنے سے کہتے ہوئے بولا تو ذرا دیر کے لیے ہم نے اپنی ساری یاد دہی بھول گئی کھلے ہوئے بھول کی طرح اس کے لئے ہوئے تھے سبھاں کو ایک فن رکھتے اور کرتے ہوئے بلیا اچھا اچھا اب تم فوراً ہمارے پیش ہو۔ ستے میں میں تھلا کوئی پسندیدہ ڈس بنائیں ہوں۔“

نہاؤں گا تو میں ضرور لائف پارٹنر بنیں آج تم کچھ ہٹانے کے چکریں ست تو دیکھو ہوں اسکو۔ آہٹانے کے بعد آج ہم سب۔ پتہ ریتووان میں ملے کر لیں گے۔

”تجربہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کیا۔“ اس نے غیر یقینی انداز میں تابش کی طرف دیکھا تو وہ ہنوز بے ہوش تھی۔

”ہاں لائف پارٹنر۔ میں ذاتی ہیں کہ وہاں بلکہ دوران سفر دور دور

فرق کا لاجر الاؤنس تھا۔ مجھے اسے کبھی پکارا نہیں ہے۔

تجربہ نے خوشگفتاری کو کھانا ہونے کی بات نہ کہنے پر ڈال کر ایسے کا اجلاس کر۔ اس میں لکھا ہوا کافی سامان شہرت استعمال

سے ملے ہوئے کو بھول کے کشتہ جو بھی نہ تھے۔ رنگ آڑی ہوئی ہینڈ بیگ اور پردے جو کبھی دل کو دیتے تھے پہلے ہوئے کچھ جو ابتداء میں پہلے ہونے نہیں تھے۔

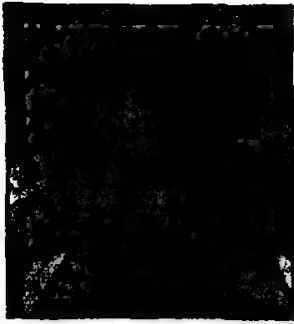
دائیں آڑی ہوئی اور ڈائیں لکڑی کی الماری اور ڈائیں کیبٹنگ ننگی دیواریں مگر ان سب کو تابش اور جادویت دینے کی اس کی شہ بہ تناسل دقت جیسے ایک دم اس کے دماغ سے محو ہو گئی۔

جلد جلد لباس تبدیل کرتے ہوئے اس نے سوچا اونپر گھر پرانا اور سامان نہ ملے گا جو چاہے تو کیا ہوا تابش کا دل تو میری محبت سے بھرا ہوا باب بڑی ت۔ ناگفتہ بہ حالات اور گذرتے ہوئے دقت نے اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی ہے۔

خوش خوشی جینے کے لئے اس نے بڑا سہارا اور کون سا ہو سکتا ہے جلا؟۔ وطن دولت مل جائے محبت ملے تو یقیناً انسان تشدد محروم رہ جاتا ہے جس میں محبت ملتی رہے تو ملے گی اندر دل میں بھی کتنے سلامتی۔۔۔ پات پر بند۔ کیا یہ میری خوش قسمتی نہیں نہیں جی ان ہی خوش نصیبوں میں شامل ہوں اگلے جنہیں سلام کوں؟۔ کریں لیکن محبت جن کا مستقبل کرنا کبھی نہیں جوتی۔۔۔ اس احساس کے تحت اسے اپنا معمولی گھر اور معمولی لباس بہت جلا لگا خود پایا وجود بھر پور۔ بھر پور۔

پھر بچوں کے اکل سے آتے ہی جب وہ بچوں تابش کے ساتھ آؤر کشتہ میں سوار ہو کر اوپن ایئر رسٹورانٹ کی طرف جا رہی تھی تو بلاشبہ اس کی ذات سرور کی آماجگاہ بنی مولا تھی۔ ہر طرح کے افسوس اور نگر سے بے بہرہ بس یہی ایک احساس اپنی پوری بچائی سے قائم تھا کہ دو عورتوں کی ماں بن کر بھی وہ اب تک نفس نفس تابش کی سانسوں اور دھڑکنوں میں سما رہی ہوئی ہے۔

کسی خوش الحان کسی خوش الحان لانا دل گیت کی طرح۔۔۔ گیت جو تھکن مٹا دیتے تھے اندوں کوئی توانائی سے ہٹنا کر دیتے ہیں انسان مر جاتا ہے۔ لیکن گیت کبھی نہیں مرتے۔۔۔ درو کے تمام چاند نہ تھا غروب ہو گئے۔ اور ایک غریب مسکراتے اس کے نارسا شہر و جد کو چکا چوند کر گئی۔



خالد جاوید



خالد سہیل

انسان، حبانور اور درخت

وہی خون

وہی خون جو اس دن
میری بندلی سے دس کر
ایڑی تھک جا رہا تھا!

وہی خون جس نے
کوئی لڑکی سڑک پر جم کر
کالے رنگ کا ایک بڑا دھبہ بنالیا تھا!

وہی خون جسے میں
بھلی گندی ٹائیوں میں بہتے دیکھ کر
ڈر گیا تھا

آج سوچت ہوں کیسا لگتا ہے
اسی خون کی آرزوئی کو تکنا
جس سے کبھی

سنہری جلد والی کتاب پر
میں نے تنہا مانا لکھا تھا
● ۵۸۵۔ صوفی ٹوکر، بریلی (یوپی)

جس دن
شمالی امریکہ کے قبائل کے
ایک انڈین نے
ایک درخت کو کاٹتے ہوئے کہا تھا
”اے درخت مجھے بہت دکھ ہے
کہ میں نے تمہیں کاٹ ڈالا
لیکن
میرے چھوٹے چھوٹے بچے
سردی سے کانپ رہے ہیں
اگر انھیں آگ کی حرارت نہ ملے
تو وہ سردی سے کھٹکھٹ کر مر جائیں گے
امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے“
اسی دن

ہزاروں ادیب
لاکھوں کاغذ

جن پر
ان کی نظموں، غزلوں اور افسانوں کے
نامکمل ڈرافٹ رقم تھے
رڈی کی ٹوکریوں میں پھینک دیے تھے

جس دن
جنوبی افریقہ کے قبائل کے
ایک نیشنلزمین نے
ایک جنگلی بھری کو
اپنے تیرکانشاہ بناتے ہوئے کہا تھا
”اے بھری مجھے افسوس ہے کہ
میں نے تیری جان لی
لیکن
میرے بوڑھے ماں باپ بھوکے ہیں
اگر انھیں کھانا نہ ملا تو
وہ مر جائیں گے
امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے“
اسی دن

سیکڑوں انسان
ہزاروں دنیوں کو ذبح کر رہے تھے
تا کہ
ان کے پیٹ سے وہ بچے نکال سکیں
جن کی کھالوں

وہ خوبصورت کوٹ بنانا چاہتے تھے

آرائش

ایک اور چہرہ واحد کو کشش شروع کر دی۔ ہر سونڈھو نڈا بد سے
مگر کو کشتال ڈالا۔ سانسیں اکٹری گئیں۔ سر سے پاؤں تک مسات میں گرم
ریت کے ڈرے چہرے پر۔ آنکھیں مجلس گئیں۔ مگر آبلہ دست میں جھپتی
چوٹی ریت کے سوا کچھ نہ آیا۔

وہ یکے گرا!

کب گرا!

کہاں گرا!

میں کچھ نہیں جانتی۔

مجھ اس بات کا علم تب ہوا جب اس روز مٹی پتہ پٹا نہ لگا کر اپنا
امادہ اپنی ڈاکو بھر پلا دیا گیا۔

— نہیں مٹی کا اس میں کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ تو اسی ہوئی خاموش
پیشی سن رہی تھی، جو پتہ پٹا نہ لگے تھے۔ شاید پٹے انہیں پہلے ہی ڈنٹ
پٹا کر خاموش نماشاں بنا دیا تھا۔

پتہ پٹے کیوں نہیں کران کی انامیری ان کیسے بن سکتی ہے ان کی
سورن میری سوئی کیسے ہو سکتی ہے! ان کی روح میرے جسم میں کیسے سما
سکتی ہے!

ایسے کئی باغیانہ خیال ذہن کے پردے پر بانوں کی طرح ابرو
اور بکھر گئے۔ میں احتراماً خاموش کھڑی سنتی رہی۔

حوریت کی خاموشی کو ہر بار اس کی رواندگی کیوں قرار دیا جاتا ہے!
میری خاموشی کا بھی یہی مطلب نکال لیا۔

اداسی کے عالم میں 'جب وہاں سے ٹپٹی' تو غنائت سیر امانت
ہلک کی کیل کو سہانے گئے اٹھا کیل کو چھتے ہی میں چوٹیں۔ دوڑتے
ہوئے نور آئینے کے سینے پہن گئی۔ یہ چہرے کو نور کرنے والا وہ
ہیرا ناگ کی کیل میں نہیں تھا۔ میری آنکھیں پیشی کی پیشی رہ گئیں۔

مجھے میرا چہرہ سلاخ نظر آنے لگا۔ مگر صحرایں تبدیل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔
اور میں نے بدحواس ہو کر ریت کا اچھال اچھال کر میرے کی تلاش
شروع کر دی۔

میں کسی حال کی صورت، کی قیمت پر اس ہیرے کو پھر سے
قابل کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس کے لئے کسی کی مدد بھی نہیں مانگ
سکتی۔ پہلے سے کوئی امید نہیں۔ مٹی تماشائیں بنی بیٹھتی ہیں۔ قہر
اس بات پر ہے۔ گو گھر میں کسی کو بھی میرے چہرے کا بدلہ ہوا رنگ
ناگ کی کیل کا نونہاں کیوں نظر نہیں آتا۔ ان کی نظروں کو کیا ہو گیا ہے۔
وہ میرا میری داد دینے پہنچے سے مجھے دیا تھا۔ میں نہیں جانتی
ان کو وہ ہیرا کہاں سے لافا۔ کہنے دیا تھا۔ اللہ انہوں نے
اسے بڑی حفاظت اور حق سے سنبھالا ہو گا۔ اسی نے ان کے چہرے
پر ہر وقت لڈ بھیلارہا تھا۔

گرمائی رات تھی۔ نوکے شام کو ہی چہرہ ملا دیکے اکٹھے پرکھا
بچا دی تھی۔ میں دواوی کی گود میں سر دھکے کن راسخان میں یں
سے دھن تک پہلے ہوتے ان گنت ستاروں کے جھوم کو تک رہی
تھی۔ دواوی اپنا ماتھی مجھے مساتے ہوئے اپنے بچے دونوں کو پیر سے
جی رہی تھیں۔ میں دواوی کی باتوں سے بے نیاز وہ میرے وجود سے
بے خبر۔ ایک عجیب تنہائی کا سماں بندھا ہوا تھا۔

تھکیاں دیتے ہوئے دواوی کے ہاتھ تھکے۔ ایک میرے
سینے پر ہلکے سے اجمار کو محسوس کیا۔ ان کا ہاتھ رک گیا۔ انگلیوں نے
نری سے اجمار کو ٹٹولا۔ اور شلیر محسوس کیا کہ اب میری عمر بچے
دونوں کی قہقہے سننے کی نہیں رہی۔ انہوں نے گفتگو کا موضوع فوراً
بدلا۔ وہ تھکے سے کہانی پڑھا گئیں۔

اس رات میں انہوں نے سیتاکا کہانی سنائی۔ دو سو رات

بڑا محسوس کیا میرے پاؤں کی حرکت جیسے غائب ہو گئی۔ ہر نزل کی طرح
چو کوٹیاں بھرنے والا میرا جسم ہلکے ہلکے قدم رکھنے لگا میری ہنسی
میرے ہفتے، دلی دلی سکلاہٹ اور حواس تبدیل ہو گئے۔
اس خوف کے کمرے میں نے ہی نہیں جیسا پایا اور تھی جس اس
کے شکار ہوئے۔

میرے ساتھ ان کا برتاؤ ہی بدل گیا میرا چلاؤ سے مجھے اپنی
گود میں بٹھا کر بار سے چو کوٹیاں تھکے۔ اب مجھے جھونے سے بچا لیکن
مجھے پہلے بھی کھار ڈانٹ چٹکارا لیتے تھے۔ اب نرمی سے پیش آنے
لگے۔ ان کی آواز میں پیادے زیادہ رحم کی شکی تھی ایسا محسوس ہوتا
تھا جیسے کوئی ڈاکٹر قبریں پیر رکھتے ہوئے مریض سے باتیں کر رہا
ہے۔ مٹی تو جیسے چوبیسوں گھٹنے بھر پر نظروں کا پہرا لگائے بیٹھی
رہتیں اور دلت مہدوت نصرت کے لگ جاتیں۔ مجھے کیسے بیٹھا
چاہیے۔ مجھے کیسے چٹنا چاہیے۔ کیسے ہونا چاہیے۔ کیسے اڑنا چاہیے۔
پہننا چاہیے۔۔۔۔

میرے اطراف پانڈیوں کا گھبراہٹ کر دیا کہ مٹی اور پیادے
اس روپ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خدا کی ذرا میں رشتے
بدل گئے۔ لاؤ، پیار، تمہارے چٹنے ایسے سوکھ گئے جیسے دھوپ نکلنے
ہی اوس کے قطرے خشک ہو جاتے ہیں۔

ان کے بدلے ہمارے سلوک سے یوں ہو کر، میں نے رفتہ
رفتہ گوشہ نشینی اختیار کر لی میری گوشہ نشینی سے نہ جانے گھر کے
لوگوں نے کیا سوچا۔ گھومیں سر درجگ چھر گئی۔ گھر دو پارہ یوں میں
بٹ گیا۔ گھر کے سب لوگ ایک طرف، اودوسری طرف پھاڑا کیلے۔
سب چلتے تھے کہ اچھا لدا کا ڈھونڈ کر میری مٹی دی کر دی جائے
پاپاس بات کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا میں ابھی کم سن ہوں مجھے
پڑھنے دیا جائے۔

میری تعلیم جاری رہی۔ مگر میرا جی اب پڑھائی میں نہیں لگتا
تھا۔ اسکول سے آتے ہی کتاب بے کرسی کرنے میں بیٹھ جاتی کتاب
میں مڑ چھاپے کھیستیا سے باتیں کرتی تو کبھی درد پدی سے،
کبھی سادوڑی کے سنگ غپ شہب ہوتی۔

گرتے سنبھلنے میں نہ لے۔ اسے کہنا ان برسوں میں میرا قد
کامیابی میں لپھے نکل آئے تھے پیادے پاس میں اب کہنے کو کچھ نہیں
بچا تھا۔ مٹی میں اندھ دھوکہ ان کے پیچھے پڑی تھیں ماس لئے

سادوڑی کی، پھر دھنسی، درد پدی کی، اس طرح پکری دلوں میں ڈھیر
لگا دیا گیا نہیں کا۔

ہر دای اور دانی کی طرح ان کا میں کہا نہ سنانے کا انداز بڑا غریب
تھا۔ ان کے انداز نے مجھے ایسا بھایا کہ میں ان کہانیوں کے ہر کردار کو اپنی
سکھی، سہیلی سمجھ گئی۔ ان کو دلوں کے طرز زندگی سے میں اتنی متاثر
ہوئی کہ بڑی ہر کر ان کے فتنش قدم پر چلنے کے زندگی جیسے کے خواب
بننے لگی۔

تھوڑے ہی دن تو میں ان کے ساتھ رہی ہوں لیکن داؤد نے
کہا نیاں سناتے ہوئے کب وہ میرا میرے داس میں ڈال دیا۔ مجھے
پتہ ہی نہیں چلا۔

نہ پانے کا علم نہ کھونے کی خبر، حیرت ہوتی ہے۔ مجھے اپنی نادانی
پر حیرت تو مجھے اس دن بھی ہوتی تھی۔ جب مٹی نے مجھے سینے سے لگایا
تھا۔ میری مٹی جو۔ بہتے خون کی بات سن کر شش کا جاتی ہیں۔ اس
نے جب میرے جسم سے خون بہنے کی بات سنی، تو مجھے سینے سے لگا کر،
بالوں کو سہلاتے ہوئے میری پیشانی کو چومنا چاہا۔ جیسے کوئی خزانہ زلی
گیا ہو۔

ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ مگر میں نے ان کی آنکھوں میں
کا ہلکا سا سایہ بھی دیکھا تھا۔ جیسے وہ چھپنے کی کوشش کر رہی ہیں
دیواروں کے مرنے کا ہی ہوتے، آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ مگر
دیواروں نے مٹی کی آنکھوں میں پہلے ہلکے سے ڈک کو پڑھا۔ اور گھر کے
بڑے بڑگوں کے کان کھٹے ہو گئے۔ جیسے دور سے آتے ہوئے
فائر بریگیڈ کے گھنٹے کی آواز انہوں نے سنی ہو۔

دوسری طرف مٹی نے اپنی آنکھوں میں اتنے ڈر کے سائے
کو زمانے کی نظروں سے چھپانے کے لئے جیسے کرکس لی۔ ساڑی کا
پلو کر میں مٹوٹا۔ مجھے غسل خانے میں سے لگتی اور میرے جسم سے
پہتے خون کا راز مشکف کرتے ہوئے یوں سمجھنے لگیں۔ ایسے
میرے کان میں ستر چوبیس رہی ہوں کہ۔۔۔ مٹی امر کے جسم
سے سینے والا خون جنگ اور نفرت کو پیدا کرتا ہے۔ عورت کے جسم
کا بہتا خون انسان اور مٹا کو جنم دیتا ہے۔

منہ چھوٹتے چھوٹتے مٹی نے کب دای کے ہیرے کو کیلیں جو
کر میری ناگ میں نیکی ڈال دی میں جانی بھی نہ پائی۔
غسل خانے سے باہر آتے آتے میں نے اپنے آپ کو اپنی عمر

پاچٹ مے: میرے لڑکے کا دھونڈنے میں۔

لوگوں کا گونا گونا قطع ہے ایک ڈھونڈو منبر اڑتے ہیں میرے لئے جی لی گیا۔ سب کا پسند آیا ہم نے بھی ایک دو سرے کو پسند کیا ہام آدمی جتنا شادی باہر پڑھ کرنا ہے اتنا پاپا نے ہماری سنگلی پر لٹایا۔ مٹی بہت خوش تھیں انھوں نے میری ٹیکلی کی رستی ڈھیل کر دی پھرے اٹھائے، پابندیاں ہٹا دیں۔ میں تلافیں جہنے لگیں۔ چیلے کی چڑکائی اور اب کے تلافی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہیں باتھ روم میں آتے کہیں باہروں میں بائیس ڈائے دویم مس ہوتے ہوتے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

مگر حق کہے کہنے والے نہ۔

اسماں کی بلندیوں کو چھونے والے دم سے زمین پر آگیتے ہیں۔

اس دن تپانے لاکر اپنی اناکی پاد بھر پر ڈالی تو میں دم سے زمین پر گر گئی۔ مستقبل کا جو پیکر میں نے بنایا تھا وہ چمکا جودہ ہو گیا۔ اپنے سانس سسک کی خدمت کے جو منصوبے بنائے تھے وہ ریت کے ٹکڑے مانند ڈھ گئے۔ زندگی کی جن راہوں پر ہم سفر کے شانہ بشانہ چلنے کا ہمد کیا تھا وہ راستے ہی میں اناکی پاؤں میں بہ گیا۔ یہ سب مرث اس لئے ہوا کہ ان کے خاندان کے کسی شخص نے ہمارے خاندان کے کسی فرد سے کہہ دیا کہ آپ نے مگنی کی رسم میں دیکھا دنے کے لئے سو خرچ تو کیا کیا۔ مگر ٹکڑے کو مرث آدمے تو کسی انگوٹھی پر خرچا دیا۔

بس ہمارے پیرائے ان کی اناگر بنے گی۔

دوسرا نڈھکھڑاتا ہے، تو بے جا ہے پورے کچل جاتے ہیں۔
چاہئے سیر کے لئے حکم جاری کر دیئے اس سے ملاحین
روزن پر بات کرنا بند، خط و کتابت بند۔

ان پر سب دروازے بند کر دیئے گئے۔

پاپے عظمیٰ اور خلیفہ کی باندیوں میں بہت فرق تھا۔ مہی کی تھاک
لانگا جا سکتا تھا۔ پاپ کی اناسے مگر ممکن نہیں تھا۔

چند روز پہلے جس خاندان سے رشتہ جوڑ کر فرموس کیا جا رہا تھا۔ اب اس میں قتل اور عیب دیکھ جا رہے تھے۔ حکمران نے والا دادا دوسرے اقباب سے لڑا کر جانے لگا۔

لڑکی والوں کا بیٹھنا دیکھ کر لڑکے مامے بھی اڑا گئے۔

چند دن گزروے تو رشتہ مرده جانہ کے جسم کھل چھو لکہ
سنت ہو گیا اور اس میں سے مٹنے والی برہ سے اس کا بدن باتوں
کے گدھ بندھانے لگے۔

کچھ لوگوں نے پتا کو سمجھایا۔ وہ نہیں مانے۔ ایک دن انہوں نے مسجد میں سے ترکہ منقولہ کا اعلان کر دیا۔

میں خوب دلوں میں چھپا ہوا بندہ نہیں ہاشکوں سے ترخا
 کر پچا آدو پچے کی گرت ناگ کی کیل میں جس گئی درد کے نامے
 میں تروپ اشہی جگر دوسرے لمحے ہی خوشی سے اچھلنے کو مل پلا
 میری باجیس کھل گئی جبرے پر ہم کے انار جھوٹ پڑے۔

مجھے تپ چل گیا۔ مسووم ہوجیا۔ میں اُجاں گئی۔ میرا آبِ حیات میرا،
 حادی کے ارمانوں کا سیراب بیت، ساتوڑی اور درد پری کے درد کے
 کا وہ ہیرا آبِ گہلا درد کیسے گم ہوا۔

اس روزِ حلقی شام کو وہ آئے۔ مجھ سے ہمیں محسوس
 کر رہی تھی کہ آج وہ ضرور آئیں گے۔ شام ہی میں گنگانے لگی تھی
 بچے سونے کے لئے آتے تھے مگر میں تھی رات کا تانا بوتا
 دیکھ کر طبیعت بانغ بانغ ہو گئی۔

ہمارے ساتھ جلوس؟ میری جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے پوچھا میں نے دوپٹا ہاتھ کر سینے پر جھیلادیا۔ اندان کے ساتھ جانے کے لئے آگے بڑھی پوچھو گی نہیں؟ میں کہاں سے جانے آیا ہوں۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔ آپ بنواس چلنے کے لئے کہیں گے میں بھیجے، مجھے علی آؤں گی۔

چند لمحے دھبے یوں دیکھا کہ جیسے میرے وجود کو اپنی انگوٹھی میں گھس لیں گے۔ پھر میرے چہرے کو اپنی احمقیدوں میں ایسے لپٹا لیا۔ جیسے پوچھا کرتے "ناریل کو کیا جانتا ہے۔"

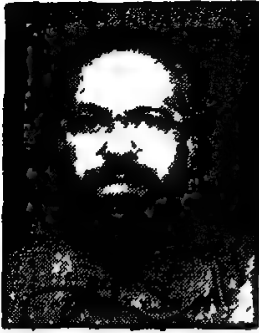
ان کی آنکھوں سے پیار بہنے لگا۔ اس میں شہزادہ ہو کر۔

میں نے ٹیکلی فوسس کی جبر حوائی مگر ہی کی طرح سکھایا۔ ان کی مگر
سائنس میری پیشانی پر جھلکی کر دھیرے دھیرے نیچے کی طرف
اتارنے لگیں۔ مائنوں کی نمی سرے پر نہ توں تک آئی۔ تو میں

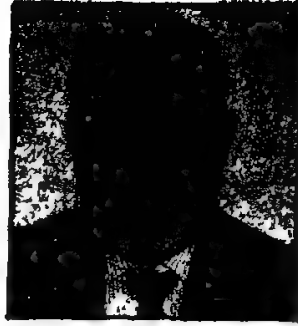
نے آنکھیں نمونہ نہیں۔ دل ڈھونڈنے کی کتاب کی طرح بج اٹھا۔

شرم سے اپنی پانی ہو کر میں نے اپنا چہرہ ان کے سینے میں چھپا لیا۔

سکھ لگا اقامہ گراہوں میں ڈوبے ہوئے ابھی چند لمبے ہی گز گزرے تھے کہ پیچھے سے تین آواز دی، میں نے شہر بڑا کر سرسرا کے



قالبش مہدی



حنیف اخگر



بسل نقشبندی

خط میں نے کوئی بھکاری نہیں کی
امیر شہرے یاری نہیں کی

کسی منصب کسی عہدے کی خاطر
کوئی تدریس بازاری نہیں کی

مرے عیموں کو گنوا یا تو سینے
کسی نے میری غم خواری نہیں کی

بس اتنی بات پر دنیا خفا ہے
کہ میں نے تجھ سے غمخواری نہیں کی

ہمیشہ سر اٹھا کر میں جیلا ہوں
کبھی سلطنت کی درباری نہیں کی

مرے شعروں میں کیا تاثیر ہوتی
سرِ فضل اداکاری نہیں کی

● لکھنؤ - ۵۰ جی ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵

مخوک ال آرزو دل کو بنا کے رہ گئے
خزین جاں میں شوق کی آگ لگا کے رہ گئے

ضبطِ نفاں نے زخمِ دل داغ و نابا دیا
حوصلے میرے گریہ رنگیں ادا کئے رہ گئے

ظرفِ حجابِ عشق ہی مج پر نمودِ حسن تھا
جلوے تمام دیدہ و دل میں سما کے رہ گئے

پردہ بے خودی میں تھے نازِ کائنات ہم
پردہ بے خودی اٹھا ہوش میں آکے رہ گئے

جبری اختیار تھا آپ کی بزمِ ازمیں
پی گئے آنسوؤں کو ہم دل کو دبا کے رہ گئے

آخگر ہمارا دل جانِ حسنِ نکل گئی
آپ دعا کے واسطے ہاتھ اٹھا کے رہ گئے

90-22 159TH STREET
JAMAICA
NEW YORK NY 11432

وہ بلا شک کوئے باطن ہے کوئی عابد نہیں
جو یہ کہتا ہے وہ مشہود ہے شاہ نہیں

اس طرح کی زندگی ہے باعثِ شرمندگی
سر جھکایا تو نے لیکن دل تراست اجدا نہیں

وہ تری فریاد سن کر کھجکھوڑے گا بھی سگر
وقت سے پہلے نہیں تقدیر سے ناخوش نہیں

کون اس دم کو رتی انسانیت کو دے گا کون
دو دو تک حیرت نہیں حیرت نہیں خالہ نہیں

با خدا اس دور کے نفرت بھرے لہو میں
لا اقل تعظیم ہے وہ شخص جو حاسد نہیں

ہے مرا تعجب میرے دُورِ دہرِ حال میں
عشقِ میرا اس لئے نیست کشِ قاصد نہیں

سے ازل کے دن سے ابے سبیلِ بیانِ میرا
میں کشتاؤں کے آس زمران میں نمودار نہیں

● رحمت کلامِ مہدی راج تالاب بانسواڑہ (راجستھان)

شکیل جاوید

بابت شہادت پہلا، اردو - ۲۳۳۲۱

شہر نج کے ہرے



ایک لمبی اڑان کے مقابلے میں دونوں زوجوں گدھ اس خوفناک جنگل میں پھنسے تھے۔ چار خوراک ہم کوئی شے ان کے لئے نہ تھی وہ بھر گئے تھے۔ آپ نے پسینے میں ترتر پڑتے ہوئے ٹھنک سے نڈھال مگرواں کا براہ راست تھاپا ایک موسم کی تبدیلی سے دن میں اخیر اچھا لگتا اور اجنبی جنگل پرسنے کے سبب وہ سسوں کا تھین ہی کھو بیٹھے تھے اس الجھن و پریشانی کے ساتھ ساتھ یہ لکڑی انہیں سستاری ہی تھی کہ قبیلے کے دو مہرے تمام ساتھی ان کی راہ و بیکو رہے ہوں گے۔ اس مقابلے کا روسے قبیلے کی سربراہی کا حق دار کون ہو گا؟ — یہ فیصلہ ہونا ہی

ان کی پرولاز کے سفوس کہیں کوہسار تو کس بلانہ محل اور کہیں ریچر اور کلا کا تھاپی سلسلہ تھا۔ جیسے اپنے پیچے چور آئے تھے۔ اور نام کا دھندلا چھا جانے تک وہ اس ہی ایک جنگل میں آ پھنسے تھے۔ یا اڑان کا مقابلہ جذباتی طور پر کئے گئے کسی فیصلے کی بنیاد پر نہیں۔ ان کی دانشمندی تجاہل کی گتوں کی گتیاں لے لے رہے اس اندام پر انہیں کوئی پچھتاوا یا غماز نہیں تھی۔

دانتہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ ان کے قبیلے کا سردار جب کی حالت میں جاں بحق ہوا تو قبیلے کے سربراہی کا سوال تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سوال کے جواب میں تقریب کا مہر گدھ جس کے ساتھ ایک دوسرے کا ستر کئے گئے۔ ان کی عقل و فہم اور عقیدے نے کئی کئی بخت کے سر پر قبیلے کی سربراہی کا تاج رکھا جائے گا جس قبیلے میں کی ک دل آزاری کوئی نہ جیتی، اور مخالفت کا کوئی گہر نہ اٹھ کر ہی ہر طرف امن و امان اور خوش حالی کی نقائیں ہلک اٹھیں اور تزلزل کے راستے داہر جائیں۔

یوں تو ان کے قبیلے میں فوجیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ لیکن اس قبیلے

کی ریت صوبوں سے چلی آ رہی تھی۔ کہ کسی فوجیوں اور ناخبر بیکار اور سیاست سے قتل۔ لکھنے والے کو قبیلے کی سربراہی کا بار بھی تک نہ سونپا جاتا اور ہنوز یہ روایت بھی ان سے منک تھی کہ بزرگوں کے سامنے مزگھوئے کی عزت ان میں نہ تھی۔ بڑے ہوتے تمام حکومت داروں کے تیر کا اثر تھا کچھ اور ہر حال صدروں کے بددینہ متعلقہ ٹھکانے قبیلے کے دونوں جوانوں کے درمیان سربراہی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ تمام یہ بلاؤں کچھ کم عمر فوجیوں جو ان سال اور سن رسیدہ بھی گدھ ٹکوند اور پریشان ہو کر آ رہے ہیں چھ بیگیاں کر رہے تھے۔

بالآخر متفقہ طور پر یہ بلاؤں کا قبیلے کی سربراہی کا دم بھرنے اور خود کو اس کا مل جھنڈے والے دونوں جوانوں کے درمیان اڑان کا مقابلہ رکھا گیا۔ مقابلہ کی شرط یہ تھی کہ سورج طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں گدھ شے شے موت میں چرنا کر رہیں گے۔ اور سورج غروب ہونا تک یہی شرطیں لٹ آئیں گے۔ ان دونوں میں پہلے واپس آنے والے کو قبیلے کا سردار بنایا جائے گا۔ اس کے برعکس مقابلے کی اڑان کے دوران اگر کوئی گدھ نیچے آ کر کہیں ٹھک کر بیٹھ گیا تو وہ یہ مقابلہ ہار جائے گا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ساتھ قبیلے کے بے شمار ساتھیوں نے خوشی خوشی عقیدت، دھواؤں اور آتش باد کے ساتھ انہیں الوداع کہا۔ مقابلے کی قطع جاندارانہ سیاست سے متبرک ایام غارتگی کے ساتھ انہیں چھوٹا چھوٹا پہنچانے کے چار تندرست دونوں گدھ ان کی نگرانی کیلئے پیچھے پیچھے آئے۔ ان طرح دن بھر سے ٹھک چاروں گدھ اس گدھ اس پر طاری شامل رہے۔ اس کے بعد ان کا حوصلہ ٹوٹنے لگا۔ بازو شل ہو گئے پسینے میں تیز بری طرح لپٹنے لگے۔ نتیجہ یہ کہ چاروں گدھ کچے بعد دیگے۔ ان کا مارا چور گئے۔

اڑان کے دوران جب ان دونوں نے دیکھا کہ ان کی نگاہیں کینا والے چاروں گدھوں اس پر طاری ہیں ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔

میں شریک ہونے والے کو اپنا صلاح کار خاص مقرر کیا۔ اس کا اس خزانہ پر قبیلہ والوں کو اپنے کے ساتھ خوش بھی ہوئی سردار نے اپنے صلاح کار کے تعاون سے آہستہ آہستہ اس قبیلے کے پرانے رتھ راجوں کو جدید تعاضوں کے ساتھ بدنام شروع کر دیا۔ جہاں تبدیلی تکلیف دہ ہوتی ہے وہاں اس میں نئی نسل کو نئے انداز کی باتیں بھی بھلی لگیں۔ جنہیں بنانسی مخالفت اور رد و بدل کا نہ صوفیوں کیا بلکہ ان پر عمل کرنے کی کوششیں بھی کرتے

قبیلے کا نظام باقاعدہ طور پر چلانے کے لئے سردار نے اپنے صلاح کار کے ذریعے کچھ اور ساتھیوں کو بھی یہاں بلا لیا۔ تاکہ مستقبل میں انہیں پیش آنے والی مشکلات سے نہ جرحہا پڑے۔ اس دن تو جیسے قبیلہ میں دھماکہ مچ گیا۔

سبھی قبیلے والے حیران رہ گئے سردار نے جب انہیں ایک وسیع میدان میں اکٹھا کر کے قبیلے کی غلام دہبود کے لئے نیت نئے پروگرام ان کے سامنے رکھے ہوئے یہ انکھان بھی کیا کہ ہمارے قبیلے والے سرحدی پہاڑیوں کے اس پار وادی والے علاقے میں جلنے سے کیوں گزرتے ہیں۔ وہ علاقہ تو بڑا ذخیرہ ہے خواہ مخواہ میں بٹنا ثانی نہیں رکھتا وہ خطہ تو خدا کی نعمتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر ہم اسے اپنے علاقہ میں شامل کریں تو ہماری ساری شکلیں آسان ہو جائیں گی۔ جیسے ہماری زمین پر آبیاری ہوگی اس کو اس کا سوا، جگہ کی جگہ وغیرہ۔ سردار کے اس نئے عزم پر ایک بزرگ نے کہا تھا۔

وہ علاقہ تو سردار اور دوسرے قبیلہ والوں کا ہے۔ اور ان سے ہماری پرانی دشمنی ہے۔ اسی صورت میں ہمارا دامن جانا کس طرح ممکن ہوگا تاریخ شاہد ہے۔ کبھی ہمارے اجداد وہاں ٹھہرا کرتے۔ اگر ہم آپس میں مالاکے موتیوں کی طرح اکٹھے ہوتے کوئی بھید بھاد نہ قائم ہو۔ ایک دوسرے کے دھوکے میں شامل رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہمارے درمیان آج ایک غلطی ہے جسے باٹنا آسان نہیں۔ جو اوٹن کارن آج بدلا ہوا ہے۔ اور نئی نسل کے خیالات بھی۔

سردار نے محسوس کیا۔ جیسے ان کے اندر کوئی آتش فشاں چھپا ہوا ہے۔ سردار نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تھا جس علاقہ پر تم دوسرے قبیلے والوں کا قبضہ بنا رہے ہو اصلیت یہ ہے کہ وہاں کسی کا بھی قبضہ نہیں اور جہاں کسی کا قبضہ نہ ہو اس سے پہلے کہ اس کا کوئی دعویٰ کرنے والے اپنا قبضہ کر لو۔ قبضہ تھا۔ دعویٰ ہو گا۔

تو انہوں نے بھی آپس میں صلاح کر کے خود کو اس جگہ میں اتار دیا۔ جہاں کے لئے منظمی یعنی قتلہ ان کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر کے لئے یہاں سستا بھی رہے۔ اور ان کے کھانے کے لئے بھی یہاں کچھ نہ رکھ لیا جائے گا۔ لیکن ان کا سوچا پورا نہ ہوا۔

چند سال پہلے یہ دونوں نوجوان گروہ اس خوبصورت وادی میں سرحدی پہاڑیوں کے اس پار سے آکر اس قبیلے میں شامل ہو گئے تھے۔ یوں تو دیکھنے میں وہ ان جیسے لگاتے تھے لیکن بہت سی خصوصیات ان میں ایسی بھی تھیں جن کے ظہور پر وہ حیران رہ جاتے تھے۔ اگر کوئی چہرہ ان میں قہر کے مختلف شے تو ان کی لمبی گردنوں پر چوک رنگ کا رواں تھا۔ اپنی اس انفرادیت کا دھجے ہزاروں کے غول میں بھی وہ دور ہنگام پہچانے جاسکتے تھے۔

ابتداء میں وہ طرہ طرح کی پریشانیوں اور آزمائشوں سے دوچار رہے۔ قبیلے کے ہر چھوٹے بڑے انہیں شک کی نظر سے دیکھا۔ لیکن اس کا پرواہ نہ کیا۔ قبیلے کے غلام کاموں میں جیسے ایک دوسرے کے کام میں آتے اس طرح جلد ہی انہوں نے قبیلے والوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور ان میں اس طرح گھل مل گئے۔ جیسے جنم سے یہی رہتے تھے۔

جب قبیلے کی سربراہی کا معاملہ اٹھا تو قبیلے کی اختراع بھی انہیں کے ذہن سے نکل کر ایک تھریک کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ جہاں وہ اپنے اس فلسفے کو پروتہ کا روائے کہ جس قوم کا قبیلے کے پرانے رتھ راجوں کو اگر بد نام ہو تو نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنا لو! قبیلے کے ڈر پوک احساس کمری کے رتھوں پر گماں یہ ان کا پہلا انکس تھا۔

وہ میانگ اندھیری رات تو جیسے تیسے انہوں نے کاٹی لی۔ تھی۔ اور سورج طلوع ہونے پر انہیں ستوں کا تین لگی ہوئے لگتا تھا اس طرح اپنی داہی پر وہ راستوں میں کھاتے دیتے سہ پہر تک پیش قبیلے میں لوٹ آئے۔ جہاں ان کے تمام ساتھی بے چین تھے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔

یہ بات بھی انہوں نے خود طے کر لی تھی کہ ان دونوں میں قبیلے کا سردار کسے بنتا ہے۔ اول کے والوں کے قبیلے کا سردار ان یا گیا۔ نئے سردار نے قبیلے کے لئے خوراک کا بندوبست کرنے اور ان کو دوسرے سہولیات فراہم کرنے کا عہد کیا۔

معاذ اللہ! کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سردار نے اڑان کے تعالیٰ

اپنے قبیلہ والوں کے تقاضے سے سردار بھی طرح دافق ہو گیا تھا یہاں
قبیلہ کے بزرگان نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مذکورہ قبیلہ کے
سرزمین پر اس قدر طاقتور ہوا ہے کہ اس کے ساتھ جہاں پہلے ہیں انہیں دوسرے
قبیلہ کے اکثریت کا مدد ملے گا۔ اپنی اہمیت کی پروردہ تو اس قدر ہے کہ
وہ اس کے حق میں اس سے رہنا چاہتے تھے۔

دوسرے قبیلہ والوں نے جب انہیں اپنے علاقے میں دیکھا تو وہ اگل
جو کہ ہو سکے وہ ہر ایک طرح انہیں اپنے علاقے میں برداشت کرنے پر
فخر اور فخر کے آئینہ بادل ہر سوز گھٹنے لگے۔ جو بے شک کامیاب
ایک نفرت میں کہ تھا انہیں پسینہ پڑا۔ دونوں قبیلوں میں دشمنی

آخر سردار کی حکمت عملی نکل لائی۔ اس نے دونوں قبیلوں والوں
کو نہ صرف خون خراب سے بچایا۔ بلکہ دوسرے قبیلہ کا بھی سردار بن گیا یہ اس
کی ہولناکی تھی۔ یا کہ فی سیاسی لحاظ ابیر حال قبیلہ کے بزرگ اس کی ہر
ہم کو نہ پہنچنے کے لیے اس غیر معمولی تبدیلی پر اس کے ذہن میں ایک سرائی
تھا کہ سردار کو اچھا لگا تھا۔ اور شاید یہی اس کا دوسرا قبیلہ
میں اب بھی ایک زوردار خاندان کی ایک دل و دماغ پر چھایا ہوا ایک
قبیلہ سوچا کہ وہ نہ ادا دیں ہر کسی کی ناک زدہ ہیں۔ یہی وہ بھی اچھی طرح
جانتے تھے کہ ان میں جو مسئلے کی کہ ان کا وہ خراب بعض انہیں ملی تو
وہ کتنا تھا لیکن اس بات کو جھٹکا جاتا تھا جو کسی کی تلواریں کہ ہر وقت
ان کی گردنوں پر تلکی رہتی جس سے ہر وقت خوفزدہ رہنے لگے تھے۔

دوسرے قبیلہ والوں کا خیال تھا انہوں نے ماضی میں ہیں ذلیل و
خوار کیا ہے۔ اپنی طاقت کے ہونے پر اس پر اس کی دیا ہے۔ ہمارے قبیلہ والوں
پر ظلم کے لئے قبیلہ میں شامل کیا ہے۔

لیکن اب اس پر اس کے علاقے پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ جہاں جب
ہم خوفزدہ نہ کامیاب نہیں دیا ہے۔ اپنے اپنے زخموں کا گین گین کر رہا
ہے۔ یہی طرح بھی انہیں ابھرنے نہیں دیں گے۔ لیکن نفرت سے نہیں
محبت سے۔

پھر سے چنانچہ رات میں ہر طرف تاریکی بکھری ہوئی۔

کہ ہمارا سردار وادیاں سوتی ہوئی تھیں ہر دم ہمارے آگے تھی انوار
دافق کے یہ وہ دار درختوں پر مختلف رنگ و بو کی لکڑیاں لہجوں میں
لٹے تھے۔ جس کی ہر ایک نقاشی سے دوش پر سوار ہو کر پورے غلا کو دھڑکا
وہ خود بولے ہوئے تھے۔ سبھی قبیلہ والے عالم بے زوری میں خواب
خفت کے غم سے بھرے تھے۔ ان کی زندگی بڑے امن و امان کے

ساتھ گزرتی تھی۔

دخو ش نما وہ جو دونوں قبیلوں کے درمیان کسی سرحد
کی طرح تھا۔ وہاں سردار کی خواب گاہ تھی۔ اس کے دروازے پر دو جوان
گروہ بطور محافظین تھے۔ جب سردار اپنی خواب گاہ میں ہوتا
تو وہ اس کی خواب گاہ سے ہر وقت دور نہ ہر گھڑی ایک زوردار لحاظ
کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ خواب گاہ کے چاروں طرف بہت
سے برقعہ زن تھیں تھیں۔ جہاں کا شمار سردار کے جان نثاروں میں کیا جاتا
تھا اس کے علاوہ سردار نے ایک ایسا دند بھی تشکیل کیا تھا جو دونوں
قبیلوں کی ایک ایک پٹی کی خیر گیری رکھتا تھا اسے سردار کی جانب
ت بہت سے خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے۔

اچانک سوتی ہوئی دادیاں اور کہ ہمارا چاکر پڑا۔
ہر طرف سے چیخ دیکار کا دواں میں گونج اٹھیں۔ محلے کی کڑی
کا پتہ اس وقت چلا جب دونوں محافظوں میں سے ایک محافظ زخمی حالت
میں اپنے ساتھی کو تیار دیکھا کہ اسے قبیلہ پر دوسرے قبیلہ والوں نے
شب خون مارا ہے۔ اس محلے میں ہمارے کافی ساتھی شہید ہو گئے
ہند پھر بھی وہ بڑی ہمدردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ تم فوراً
جاؤ! اور سردار کو اس خطرے سے آگاہ کر دو!

اور وہ محافظ اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر سانسوں کی ڈور توڑ گیا
۔ دیکھ کر وہ سردار محافظت میں بھر گیا وہ قہری کے ساتھ سردار کی خواب
گاہ میں داخل ہوا۔ اور اس خطرے سے اسے خبردار کیا۔ بیکت دیکھ کر
وہ حیران رہ گیا کہ سردار اپنے صحت کار کے ساتھ بیٹھا ہوا اطمینان
سے گفتگو کر رہا تھا۔ خبر سننے کے بعد میں جب اس میں کوئی تبدیلی نہیں
آئی تب محافظ نے اپنی بات کو دہرایا۔ لیکن سردار اب بھی کوئی گفتگو نہ کیا
اس نے محافظ کی بات ہی نہ سنی۔

محافظ نے جب ہماری بار سخت یہیے میں اپنی بات کو کہا تو سردار
نے غصے میں آکر اس کی گردن لڑائی دیکھنے ہی دیکھنے محافظ متحذرا ہو گیا۔
دونوں قبیلوں میں زوروں کی جنگ جاری تھی چیخ دیکار کی
آوازیں وادیاں میں گونج رہی تھیں۔

"محافظ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے! آؤ۔ باہر نکل کر دیکھیں۔"
سردار بیٹے اطمینان سے محلے کار کے ساتھ خواب گاہ سے باہر نکلا۔
اس کے قبیلہ والوں کے ساتھ جنگ باز تھی اس محلے میں اس کے بہت
ساتھ بوڑھے، کمزور و کمسن، اور جوان ہمارے گئے تھے۔ ہر جگہ
[۱۰ صفحہ ۳۲ پر دیکھئے]



A black and white portrait of a man with a beard and mustache, wearing a suit and tie. The image is framed by a thick black border.

سنگ دیواروں بہت آنتاب کی صورت
ہوا اسناد سے مجھے تو حباب کی صورت

میں تیرے واسطے ہر سانس ہو گیا ہے تجھ پر
 نیک رہا ہے مگر تو کب کی صورت

عجیب لوگ ہیں اپنی غرض سے ملتے ہیں
یہ شہر اب تو ہوا ہے عذاب کی صورت

پیارے آنکھ کے پانیوں سے گھٹ گھوٹا ہوا ہوتا ہے
بدن میں آتا ہے تو، تو شراب کی صورت

کسی کی یاد تیرم ٹھائے جاتی ہے
جوان جسم کے رنجین خواب کی صورت

● بی۔ ۲۔ ۱۷۷، تعلیم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن
لاہور۔ ۱۸

وہ کون ہے! مرے اندر سفر میں رہتا ہے
ہو کے نام پہ خانوں کے گھر میں رہتا ہے

مجھے تو لگا ہے پاگل ہے گھر کا سناٹا
تمام رات جو دیوار دور میں رہتا ہے

عجیب فیریضی ہے شہر ۷ منظر
ہر ایک اپنے ہی سائے کے ڈور میں رہتا ہے

عجیب بات ہے گھبراؤ کر کے بچوں کا
ہوا کا زور بڑھے کہ وہ فرمیں یہ سنا ہے

ہم اپنی نادر کا رخ کس طرف کو موڑیں آخر
 ہو گا کھٹن میں ہے ساحل بھنور میں رہتا ہے

مغرب پر اتنا عقائد جو ایک شخص صحیفے کی طرح
 ذہن میں پھرتے سما یا ہے ارادے کی طرح

کون آواز کی مانند متلم میں آ کر
بولتا ہے مری تحریر میں لہجے کی طرح

جب بھی جذبات کی لہروں میں تہوج اُٹھے
 روک لیتا ہے کوئی بٹھو کے کنارے کھڑا

جس نے یہ کہہ دیا ہے جان دیلوں سے مجھے
میرا حق بننا تھا اس شخص پر دعوے کی طرح

اس کی ہمارا ہی ہے اب کیسے بھروسہ کروں
حوصلہ دیتا ہے جو فائدہ کو ڈرا دے کی طرح

● ۶۹۷۔ اسٹریٹ ۹۲، جی ۹، اسلام آباد پاکستان



مجموعہ: سفید انجم
NESEBJORDET 15
1266 OSLO 2 NORWAY

نارویجن۔ شیل اسکسن

تصادف

شیل اسکسن کو ہم عمر نارویجن ادب میں بہ حیثیت افسانہ نگار بہت اہمیت حاصل ہے۔ انہیں عالمی ادب میں نارویجن ادب کا نام بھی بکھا جاتا ہے۔ ایک نفاذ کے مطابق اس مصنف نے نامتو کتاب ہے کہ معیار اور مقبولیت ایک دوسرے کی ضد کہنے بولنے لازم و ملزوم ہیں۔ شیل اسکسن ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے ان دنوں اوسلو میں رہائش پذیر ہیں۔ اب تک ان کی گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ۵ ناول اور سانسوں کے مجموعے شامل ہیں۔ ان کا آخری ناول ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اب تک ہم مجموعے انسانوں کے شائع ہو چکے ہیں۔ جس کی تصادم ان کے آخری مجموعے ٹیک بہت بڑا احاطہ بیان۔ «ET STORT ODE LANDSKAP» سے منتخب کیا گیا ہے [س۔ الف]

اور یہ شدید گرمی۔ اس نے سوچا۔ دنوں کا رہیں جب چوک میں یہ نہیں تو وہ فکر انگیز۔ سلیٹی رنگ کی کار دائیں طرف کو مڑ گئی۔ اور سفید کار بائیں طرف۔ سفید کار دوسری کار کے اٹے ہاتھ دے پھیلے دروازے سے جا کر ٹکرائی تھی۔ اس ٹھنک نیز منظر میں سلیٹی رنگ کی کار کے ڈرائیور نے کھڑکی کا شیشہ پیچے کرتے ہوئے جہ مزید آیا وہ کہنا ضرور کیا۔

لعل ہے تم پر۔ جیسی آدمی۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟
میں نے آہ کو دیکھا نہیں۔

مجھے نہیں دیکھا۔؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم مجھے.....
مجھے تم کیسے نہیں دیکھ سکے۔؟

معلوم نہیں۔ میں نے بس آپ کو ٹوٹس نہیں کیا۔ کیا آپ دروازہ نہیں کھول سکتے

ہیں..... تمہاری میں..... یہ مڑ چکا ہے

دوسرا دروازہ ٹرائی کریں

اوجھلایا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں احمق ہوں تمہارے

خیال میں یہاں پر دو احمق اکٹھے ہوئے ہیں؟

میں کہہ رہا ہوں جناب کہ آپ کو میں نے نہیں دیکھا۔ میں

تھوڑی دیر تک وہ کھلی ہوئی کھڑکی کی اس کھڑکی دیکھتا رہا۔ فٹ پاتھ خیال تھا اتوار کے دن دو چکرورٹا کھڑکا دھڑکا تھا۔ اپنا اندر بھی داخل مالا جیسے اس کا خالی پن اس کے اندر چلا آ کرے کے اندر دئی طرف کرسی پر بیٹھی تھی۔ مانی جوی سے کچھ بوجھا تو وہ چپ ہی رہا حالانکہ جواب میں صوف ہاں یا نہیں کہا جا سکتا تھا۔

وہ ایک مکمل طور پر خالی ڈی اس تھا بغیر اس کی طرف دیکھ وہ کمرے سے باہر چل دیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سداوہ کہہ رہی تھی انھوں نے نہیں کیا ہو گیا ہے؟ واسطے کے ہال میں سے گزرتے ہوئے وہ میز چھایا اٹھ گیا۔ اس میں ٹھنک بھرے قہوں کے اوپر وہ انوار میں باہر نکل آیا اس نے سوچا۔ سورج کی رادھتسی میں اسے گرمی کا احساس ہوا۔ ٹھنک یا کر کے وہ دوسری طرف کے ڈی اس پر سرائے میں چلا گیا۔ وہاں رک کر اس نے اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا وہ اسے نظر نہیں آئی چار سترہ عمارت کے سائے میں وہ چل پڑا۔

چند سو میٹر کے بعد وہ چوک سے اس ایک سفید کار کے گرد جانے کے انتظار میں رہ گیا۔ مخالف سمت سے ایک سلیٹی رنگ کی کار آگئی۔ اس کے علاوہ وہاں پر کوئی دوسرا ٹھنک نہیں تھا۔ دو کاریں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اس کی وجہ اتوار کا دن ہو گا



وہاں بیٹھا رہا۔ پھر بالوں کو نوٹک کرنے کے بعد اس نے بڑے چہن لئے۔ کافی بنا کر وہ بالوں میں تنگھی لگائے بیٹھی تھی اسے دیکھ کر وہ اداسی سے مسکرائی اس نے ہمت سیٹی۔

مزہ آگیا۔ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔

وہ کافی اٹھ بیٹھ ہوئے بولی: کیا مجھ سے جی بھر بچا ہے؟

وہ ہلے۔ تم ہر بات کو اپنی طرف لے جاتی ہو۔ اس کا

تہاں سے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

کیا تم کسی اور کے ساتھ.....

نہیں اگر ایسا ہوتا تو بات کا تعلق تمہارے ساتھ بھی ہوتا

تعلق میرے ساتھ تو ہے۔ تم نے میری بات کا دودھ

جواب نہیں دیا اور یہ میں تھی جس کے پاس سے تم اٹھ کر چلے

گئے۔ بغیر کچھ کہے

اس بات کا تعلق صرف میرے ساتھ ہے۔ میں اور

یہ لفظی انوار۔

لن طعن نہ کر دیلینز۔

تم تو جانتی ہو کہ انوار کے دن مجھے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

یہی تو ایک دن ہے جو صرف ہمارے لئے ہوتا ہے۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ ہاں اس کی طرف دیکھا ضرور

وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔

تم نے جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔

کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ کافی کہے لئے شکریہ۔ وہ

کھڑا ہو گیا۔

تم نے تو یہ پی ہی نہیں۔ اس نے کہا۔

پی ہے۔ وہ بولا

الغول نچے نہ بنو۔ تم نے نہیں پی۔

پی ہے۔ میں نے پی لی ہے۔

تو بیک تک نہیں لگائے۔ آئیں اور خود دیکھ لیں۔ بریکوں کے نشان تک نہیں ہیں صاف ظاہر ہے کہ غلطی میری ہے۔ لیکن میں کچھ کر نہیں سکا۔

کچھ کر نہیں سکا، کچھ کر نہیں سکا۔ لعنت۔ کچھ کر بھی سکتے ہو؟

پھلانگتے ہوئے وہ بولی سیٹ پر پہنچا پھر کار سے باہر آگیا

گھوم کر اس نے کار کے نقصانات کا جائزہ لیا۔ دانت بھیجنے ہوئے

اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ دوسری گاڑی کا ڈرائیور اس کے پاس

آگیا۔ مزید انہوں نے کیا کہا، یہ انہوں کو پتہ نہیں چلا جس راستے سے

وہ آیا تھا اسی پر وہ واپس چل دیا۔ اسے پسینہ آگیا تھا۔ اسے اپنا

چہرہ گرد آلود محسوس ہوا۔ اس کا ہنسنے کو جی چاہا۔ اسے اپنی بونیا

کھڑکی میں آگے جھکی دکھائی دی اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے

دیکھا نہ ہو۔ اس کا کیا قصور؟ اس نے سوچا اب کہیں یکاڑے

ننگ بولے۔ اپنی نظریا اس نے فٹ پاتھ پر جھادیں۔ وہ کر بھی کیا

سکتی ہے۔ بس میرے ہنسنے سے پہلے کچھ بولے نہیں۔ اس نے

سڑک پار کی اور دوسری طرف آگیا۔ پہلے ڈیوڑھی میں داخل ہوا

اور پھر پٹریاں پڑھ گیا۔ وہ داخلے کے ہال میں کھڑی تھی۔

کیا بات ہے انہوں؟

کوئی بات نہیں

کچھ تو ہے انہوں۔ میں نے بات کی تم نے جواب نہیں دیا۔

اتنا تم اٹھ کر باہر چلے گئے بناؤ کیا ہے؟ پلیز!

کچھ بھی نہیں۔ میں ذرا ہٹا لوں۔

پچھلے آدمی بنو انہوں۔ تم مجھ سے اس طرح لا پرواہ ہو جاتے

ہو کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں۔

تم کچھ بھی مت سمجھو۔ میں چل کے بناتا ہوں

وہ غسل خانے میں چلا گیا۔ اس نے کپڑے اتارے کہنے کے

لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ اس نے سوچا وہ نہیں سمجھے گی۔ اس میں اتنی

سمجھ کہاں۔ اس نے پانی کھولا۔ ٹوشیوں کو اس طرح گھلایا پھر آیا کہ

کہ ٹھنڈا پانی آنے لگا وہ دھار کے نیچے اس طرح جم گیا کہ توڑی

دیر کے لئے اس کے ذہن میں کچھ دیر اور غسل کر لینے کے علاوہ

کوئی خیال نہیں آیا۔ پھر اس نے زیادہ دیر تک ایسے نہیں کیا

پانی بند کیا اور کپڑے ڈھکن پر بیٹھ گیا۔ شاید سب قصور انوار

کے دن کا ہے۔ اس نے سوچا۔ کئی منٹ تک وہ سکون کے ساتھ

اردو لکھیے، اردو لکھیے، اردو لکھیے



ارشاد کمال

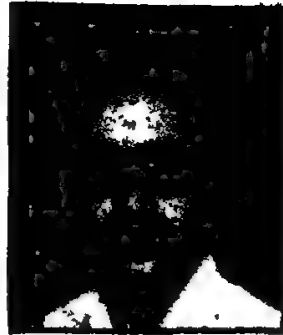
ذمہ داری

حصا یغوث و ہراس توڈ
تم اپنے مشہور دیوں سیٹو
زمین سے اٹھو، نکل پہ پہنچو
پھراں جہاں پر نگاہ ڈالو
خدا را اپنا مقام سمجھو!

شیعوہ مخصوص جو دہیت ہوا ہے کو
ذرا م اس سے جو کام لے لو،
تو شود شب خوں جو ہر طرف ہے
یہ خود بخود ہی خموش ہو گا۔

یہ العطش کی صدا جو ہر سمت اٹھ رہی
تم اس پہ لیک کہہ کر اپنی
فرات کا در خدا را کھولو!

خزاں کی محفل میں رنگ و بو کے
مذاکرے کی سبیل تم ہو،
تمہارے شالوں پہ ذرہ دار کتنی گھو
کہ منحصر ہے بہتائے عالم
نقطہ نہیں پر!



ترجمہ، ریحان ثروت

نوحہ

نابا بلی سرِ اربابوں
رنگ برنگے پھول
لہراتے ہوئے آبشار
تھیللاتے ہوئے ستارے
مانوق الفطری دکشی کا رنگ لے
ایک فیروز صحن کی تصویر کرتے نظر آتے ہیں
لیکن جب میں انھیں قریب سے دیکھتا ہوں
تو یہ بالکل بے رونق معلوم ہوتے ہیں
جو کہ احقاد خون ریز ہیں
نیز عہد تا بہ عہد نابا بلیان اذیتوں
کے بین غموت میں۔

میں اپنی نصف حیات اس شخص کو بخش دوں گا
جو ایک روتے ہوئے بچے کے لبوں پر تبسم بکھیر سکے
اور بقیہ آدمی زندگی اس فرد کو دے دوں گا
جو ایک گل شکستہ کھمانے کے دست برد سے محفوظ رکھ سکے
میں ایک نغمہ مہاجر کی خاطر ہزاروں سال چلتا رہوں گا
اور کل بھان کی خوشبو کے ہمراہ
سادے پر شور و سحر دوں کو مجبور کر لوں گا
میں جو کہ انسانیت کی تمام تذر داریوں کے ساتھ ایک انسان ہوں

۲۰۱۲ء، شنبہ ۱۵ صفر ۱۴۳۴ھ، ۲۵ دسمبر ۲۰۱۲ء، انارکلیکے پورے خلیفہ گیارہواں کے پاس گئے ہیں
کاغذی لالہ - بہار شالین (نائلہ) بہار



حنیف ترین

سویچ

ابو ترابے گی
سفیدی سر کو اک دن بخش دے گی
پسینہ بن کے ماتھے پر اُگے گی
تجھ پر باد کر کے بھیسنے گی
یہ آنکھوں کی نمی لپا کر برٹھے گی
ارادوں میں لے گی
تری آنکھوں کی نیندیں تھیں لے گی
چلن پلکوں کو دے گی
کبھی محفل میں تنہا چھوٹ دے گی
کبھی اک بوجھ خود تجھ پر بنے گی
لوں کی تمام عمر ترے ساتھ جب ہمیں چلا گیا
تو تو کبھی سوچ یہ کس دن نے گی
حیات نو کے ہر اک ذلزلے کو
کسی دن خود ہی روشن کرے گی!

19-HARRINGTON DRIVE
LENTON SANDHOTTEN
شماره 19 ہارنگٹن دریں میں لٹن ساندھوٹن
- سیرے پورٹ ہفٹن -

ہر مذہب میں دنیا کے تمام مذاہب کے داخلی اور خارجی
 تنظیمیں لائی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ "مذہب" جس طرح انسان
 میں پیدا ہوا ہے، لیکن اس میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں، انہی
 مذاہب میں کوئی کسی گمشدہ انسان کو جاننے کی کوشش
 کرنا ہے۔

انہا میں مائیں کی توتی سے مرہا کی نے لری چہ اس میں
توتی کی لں تو سے طرہ کی چہ لوگ بھی لاریت سے اریاں
کھے جس سے لیکن چہ طرہ پیسے ایک لں میں نہ نہ حاصل
کرے والے سائس وال سے لں کی چہ خاکہ سے بھی کی نے
کوئی تکریر نہ جانتی تو اس کی اس میں نہ لری طرہ توتی۔

☆ سلطان محمد بن محمد - اسے صاف پڑھ

ادھر جی (اے) میں جا
 فکر و در میں صحت بہت اگر نفی کے اندک علاج
 کے کتاب محمد ہوتا ہو کر جہت۔ بہت اگر فکر کی
 دشمنی دہل ہے۔ کھنکھ میں ان سبھی اندک در سرچ کیا جا
 جائے۔ اس اندک کو کھنکھ میں علاج ہو جائے۔ سرور
 حب سے حب تر ہو جا رہا ہے۔ ایک طرح سے "خاطر"
 اس معنوں کی نشو و نما کی گئی ہے یہ نگاہ سے کھنکھ میں
 ہے۔

☆ محمد اسلم - ہنس مں سیر عیسیٰؑ میری مثنوی ۵۸
خزائن نے خود کیا
وہاں کے نقش سے آپ نے جو کب کہا، جو کب لکھے
سے سب اگر اس صوفیوں سے مل کر جانے، چروگوں

[illegible]

بکری لڑی نہیں یہ دیکھ کر سردار کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ صلاح کار سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

”اب ہمارا ایک بل بھی یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔“
 ”لیکن سردار! — باری بھائی ہوئی اس سیاسی بھڑک
 کا کیا ہو گا جس کا یہ خاتمہ ہے؟“ صلاح کار مرزا باجوہ حیرت ہوا ہوا تھا۔
 ”وہ اسی طرح برقرار رہے گی کیونکہ انہی میں ہم اپنے جان نثار
 چھوڑ دے جا رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر مرد نے اپنے ننھے بیٹے پر اسے جیسے وہ کسی بی اڑان کا ارادہ کر رہا تھا۔

سرسبک کہ ہمارے سرسبز خوشنودادوں کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے سزا دے سچے دیکھا۔ اور اپنے صحن کا سرسبز کہنے لگا۔ "تھوڑا کیا خیال ہے۔ یہ لڑائی ختم ہو جائے گی۔ ہرگز نہیں کہیں کہ اس طرح آپس میں لڑنے دیں گے۔" ۱۱

۱۔ ہر ایک کو اپنی سے پہلے کیا فائدہ پہنچے گا مگر دار۔؟
۲۔ نامہات : اگر کسی طرح لڑتے ہوئے تو وہ دن قدر نہیں کہیں
جہاں تاجن ہر لڑے گا اس سے سارا ذخیرہ ملا کہ ایک دن ہماری ضرورت

بقیہ صفحہ ۲۲۔ آزمائش

سمجھئے ہنایا تو تک کی کیل ان کے سوشل کے تارے ہیں ایک گئی۔ اس
 مرد کے میں تراب اٹھی۔

مجھے یقین ہے اس وقت امیر اودھ آباد میرا اکیلے سفر کر
الغے سو نہ کہ ادنیٰ کشتہ کاری میں کہیں ایک گنا تھا۔

میں خوراً میرا لے۔ ان کے گھر جانے کے لئے ٹھہری، مڑتے ہی
میں جہان رہ گئی جیسے میرے پر زہیں سے چپک گئے ہوں، دروازے
میں ایک چوہا سا نظر آیا، میں نے غور سے دیکھا دروازے میں چپا
جان کھڑے، اس سے آتی ہوئی روشنی کہ روکے ٹھہر رہی تھی۔

قبل اس کے کہ دل سے وصلہ پاکر میں قدم آگئے بڑھاؤں نیا
 ل آواز میرے کان سے محوئی۔ قہریاں ہر جاؤ نہیں دیکھنے کچھ لوگ
 اُسے یہاں میرے پیروں کی حالت جانتی تھی۔ ہاتھ جواب دے
 گئے۔ آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ میں گرتی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گئی۔
 میرے اندر کی عورت آواز اٹھ کر کچھ کہنے لگی۔



فکر امروز



ہماری شاعری ماحولی خصوصیات کی حامل
ہونی چاہیے اور زیادہ سے زیادہ فطری -
ہمارا ہر شعرا اپنی جامعیت، انکسیت اور
موضوع کے اعتبار سے ایک جملہ نظم ہونا
چاہیے - ہماری ہر نظم ضروریات زمانہ کے
مطابق، اپنی ملک اور فرائض و وطن کے
لئے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیے۔
اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذبات
عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں
پارے نوجوان ماضی، حال، اور مستقبل
کا صحیح انداز کر سکیں۔ جو ہمیں تدبیر منزل
اور شاہراہ ترقی بتائے اور بلند و بطیف
حالات سے ہماری روح میں کیف و تسکین
کی موجیں پیدا کر سکے۔

[۲۹ نومبر ۱۹۶۱ء]

سیلاب اکبر آبادی



مدیر
افتخار امام صدیقی
معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

نوس لائے
۶۵ روپے
لاٹریریل سے
۹۰ روپے

تاخر خریداری
۱۰۰ روپے
معاونین سے
۱۰۰ روپے
مالک غیر
۲۵ ڈالر - ۱۵ پونڈ

پیشکش شدہ: ہادی (Hadi) کی شاعری ماحولی خصوصیات کی حامل ہونی چاہیے اور زیادہ سے زیادہ فطری - ہمارا ہر شعرا اپنی جامعیت، انکسیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک جملہ نظم ہونا چاہیے - ہماری ہر نظم ضروریات زمانہ کے مطابق، اپنی ملک اور فرائض و وطن کے لئے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیے۔ اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذبات عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں پارے نوجوان ماضی، حال، اور مستقبل کا صحیح انداز کر سکیں۔ جو ہمیں تدبیر منزل اور شاہراہ ترقی بتائے اور بلند و بطیف حالات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کر سکے۔

فنِ پارہ کیا ہے، کیا نہیں؟

میرے خیال میں شاعری کی تعریف کتنا ایسا ہی ہے جیسے عددا کی تعریف۔ شاعری ایک پیچیدہ ترین عمل ہے۔ پھر جب شاعری کو کوئی معینہ تعریف پہنچی نہیں سکتی تو یہ طے ہے کہ آپ اپنی ذہانت و مطالعے کی اسل پر زور دیتا تو جو محنت کے ذریعے کسی شاعر کو اچھا، بُرا، چھوٹا، بڑا، اتر و کمتر ہو جانا چاہیں گے وہ

دلیلوں اور حوالوں کی ثابت کر دیں گے۔ انکار (کروٹی) اور ساقی (کھلمکھا) کے جوشِ خیر، ایک اہم مثال، لیکن فنِ پارہ اور فنِ کار کا اپنی جگہ دھوسے رہ جائیں گے۔ شاعری کی تنقید کے ساتھ بغیر کسی سہولت کے کسی فنِ پارہ میں اترنے کے بجائے اس کے اطراف و اکناف کی باتیں کرنا اور اپنے مسلح علم کا مظاہرہ کرنا۔ اپنی پسند یا پسند کے انداز میں انتہا پسند ہو جانا جب کہ کسی بھی فنِ پارے کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنا زاویہ نگاہ درست رکھیں۔ فنِ پارے کو بالکل انفرادی حیثیت سے دیکھیں۔ شور کی آنکھ اور فنِ پارے کے دیکھنے کے مناظر بالکل ختم اور واضح ہوں یعنی بلا واسطہ ہمیں اس عمل سے گزرنا ہوگا۔ زاویہ نگاہ اور فنِ پارے کے درمیان جو کچھ ہے، وہ اور فنِ پارہ دو مکمل چیزیں ہیں۔ شاعری شخصیت کو سمجھنا اس کی ذہنی ساخت کا اندازہ کرنا فنِ پارے کے اندرون میں جو جہاں آباد ہے، اس کی رسائی اور فنِ پارے کی قدریں ان کے انحراف کی تفسیل کرنا جو محروم اور لفظوں میں کہیں گے۔ پہلے سے طے شدہ مفروضوں اور کلیتوں سے مدد تو لی جاسکتی ہے لیکن صرف انہیں برا ٹھہر نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں بلا کسی اور کوئی شاعری کا حصہ ہے کہ وہ قاری اور سامع کے ساتھ مکالمہ کرتی ہے۔ قاری، سامع اور شاعری کے درمیان طرح طرح کے واسطے اور بی بی لیکن یہ مکالمہ ان لوگوں کے نہیں جن کی ذہنی تربیت ہی نہ ہوئی ہو یا جو بے زبان اور انگریزی شاعر کی مدد سے شاعری میں اختلافاتی روشن ہوئے۔ بغیر سامع قاری کی ہر ایک ہلکی والے ساتھ بڑھ جائے۔ اور اسی کو شاعری کہہ لینے کی غلطی کرتا رہے۔

شاعری یا فنِ پارے میں سامع کے نفسیات داں ہونے کا گمان بہت مشکل ہے۔ کوئی کہہ دے۔ یہ ایک طرح کا ذہنی عمل ہے۔ یہی عمل آج کی شاعری کا خارجِ گمان ہے۔ میری مشاہدہ اور تجربے سے گزرتے ہوئے، اوٹھے ہوئے خیال چلتے ہوئے، پہلے، مضامین، نثر اور شاعری کے درمیان، اور ایک طرح کا سماج یا اوپر پہنچے ہوئے شاعرین کو آسانیا تو فرم کرے، لیکن کوئی بھی شاعری کو اس کے اندر نہیں کرنا کہ نظر

تقلید کی، تو یہ خصوصیت کسی شاعر کا شاعر سے قریب کرے، میرے خیال میں شاعری دنیا کی خوب ترین چیز ہے۔ لیکن یہ کہیں کہیں اور نہیں آتا اور نہ ہوگا۔ تخلیق عمل کی ایک طرف توں بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے سے موجود کسی فن پارے سے

سے مختلف کوئی فن پارہ ہو۔ (جادی)

فرشتہ گار کا کاجر ۵ مہر احامد بیگ
اب پر تنقیدی مقالہ ۱۹ رفعت اختر

داستان کا اسیر ۹ عزیز پری ہاس
یوحنا آئیگو کی عنوان میں ۹ راشد جمال فاروقی
سیاہ سورج ۱۸ شاہد عزیز
انتشار ۱۱۸ فوری مینا فے
نئی خلیج ۱۸ معراج سامعنا
ماں، دنیا اور کائنات ۱۲۷ افتخار امام صدیقی
ایک نظم ۱۲۷ افتخار امام صدیقی
نام نہاد قلم کاروں سے خطاب ۱۲۷ افتخار امام صدیقی
ایک نئی دنیا ۱۲۷ افتخار امام صدیقی

سنگی ہاشمی ۱۰ ہرچون جاوہر
کابوسی ۱۶ محسن عثمانی
دروازہ [نا تجربی] ۲۲ عابد البوسریما
[ترجمہ] محمد احمد قاسمی

رشید ارکان ۱۵ محسن جنگا زری ۱۵ محسن انصاری ۱۵

ماہی جھنڈپن
چینے کے لٹائے شاعری
تجربہ و مذاخا ضلع ۲۲
شور و غارت۔ دو تجربہ نگار کی بقی چلے شعلے
طلاق۔ محبت کی بے گندہ چٹکے سے
یہ میں نے نہیں بتایا۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا شوٹنگ سے
پر وں والی چسپڑا چھپ چکے روٹنگ
گندہ ماہر وقت دانگے شیا فے
میں ایک سیب ہوں فوٹین لیرے

غزل ۴ مصطفیٰ سیدواری
غزل ۴ شہید اعجاز

حیرت شعلوی [نام] ۲ دورہ انصاری

فن پارہ۔ کیا ہے، کیا نہیں ۳ اتنی سام صدیقی

۲۸ قارئین و قلم کار

شمارہ نمبر ۳ [۱۹۹۵] جلد ۷۷



اندہ اندہ رکھے ہوا ہوں باہر سے تانبہ ہوں
کب سے دوستی نہ تھا شوں پر میں زندہ ہوں
پانپ رہا ہوں گل گل پہچان کا بوجھ اٹھائے
میرے شناساؤں میں تم سے بہت شرمندہ ہوں
مجھ کی صورت کھر کی میں جاندی کا ہاتھ رکوں
میں جھلسا تی دوپہروں میں خواب دہندہ ہوں
کون ہو تم؟ یہ پوچھ رہا ہوں میری خبریں مجھ سے
حسب نسب کے چلے گا میں اک کھارندہ ہوں
پترا ہوں اک گیراج میں ٹوٹے ٹاٹے کا ٹکڑا ہوں
تجھ منفر پہ ہنسی صدیوں کا بائندہ ہوں
ڈھلتی عمریں بدل دیتی ہیں ریتیں اور نصیب
کل تک نہ ساز تھا آج فقط سازندہ ہوں
میرے تیرے یحییٰ سے کابلی چاہیں کوئی
گجر تو پھلے وقت کا میں دوبار آئندہ ہوں

اعراف میں نئے نئے آفاق کیا کریں؟
ہم غیر قدیم کے مشتاق کیا کریں؟
شوکتِ دگوہ میں دل کی لہو چہ نہ آہ ہے
مطہس میں جسم و جان کے رشتاق کیا کریں؟
ہر مٹو بکھر رہا ہے دریدہ بدن کتاب
جن پر ہے پتر نام وہ اور آقا کیا کریں؟
جہانِ جنگلوں میں ہے وہ دھوڑیوں کا رشت
اب جھوٹوں کے دیکھنے جتنا ق کیا کریں
بے تربیت ہیں مکتبِ مکرور یا سے در
ہم وحشی لوگ صورتِ اطفال کیا کریں
اس دھندل روشنی کا نہیں کوئی عیاں علانی
لوٹے چرلے ہوں تو نئے طاق کیا کریں

بہ خط شاعر



من بھلاؤ کا بھید ہے، دھوپ چھاؤں کا جمال
سیدھی سبھی راہ پر تیرھی یزیدی چال

ہنگے کا کس مانگنا، کسا دانا کا دان!
ڈکھ کی جھولی مٹنے لگی، کس کھ کی بے ایمان

اک بانڈی کا شردیہ، الگ الگ تقدیر
میں چاکھوں باسی کڑی، تو چاکھے تو کھسپر

مالو کی تاربت جھبی، جھبہ سُرت کا سنگ
پہنا دے سے ڈھب دیکھ بولی نہیں سے تنگ

دش دیکھ تو دش لکھ، لکھو ستر بلا سین
ہر جنگل میں سانپ ہیں ہر بن میں ہیں!

نہ چنگاری دم پڑی دھوپ دھوپ کی چیت
اونگھے تو بس کھینا جاگ پڑے تو پیت

آگے جاتے دوست ہی اپنی ڈاک ٹال
ہم گھر بیٹھے اپنے، جانیں شہر کا حال!

بند سفر کی دھار پر مے گئے رستے جلی
من سیز باقی رہا، ٹوٹے ذہن بلی!

اند دلا باطن جان کر، گھبرا گھبرا جائے!
روز مہادت خوف سے، اپنا وزن کرے

اپنی اپنی سوچ ہے، سوچ سوچ کی دھار
دنیا ناپے چال کو، ہم تاجیں رفتار



مرزا حامد بیگ

گورنمنٹ کالج، اٹلی، پاکستان

فرانز کا فکا کا جہان

تحقیق کار لارنٹز اس کے ذہن اور لادوں کے چاروں طرف سے ہے۔

اس قدیم کبادت کے سنی فرانز کا فکا کے زندگی کرنے کے عین اور قریب سرانے کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ کا فکا ۲۰ ویں صدی میں یوکرین کے ولین عددیٹروں کے جو جن ادب کا ایک منفرد نام ہے اور اس کی شخصیت کی ہر پریت ایک لایق مقلد مسئلہ۔

کا فکا کی تحریروں اور اس کی زندگی کے جتن کرک دو پہیے سے جدا کر کے دیکھنا اور پرکھنا بھلے خود ایک بڑا ابہام پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ جب کہ ابہام اور لایقیت کے ایک مثال اس کی اپنی زندگی تھی۔ اور دوسری مثال کا فکا کی ناول وادرات اور اس کے افواہوں، ناولوں، حکایتوں، خاکوں اور ناولوں، تنقیدی خاکوں، اور خطوط کی صورت میں بکھری ہوئی ہے۔ کچھ یہاں یہ ہے کہ کا فکا کے جن عجیبے ناول شطرنج کو اپنے کسے کے ایک وقت وجودی، تاثیریت پسند، مارکی اور قسسی کیفیات کے ماہر رہا۔ یہاں تک کہ یہ دیت اور مصیبت کے علم پر دار کسے بڑھے اور کا فکا اس کے باوجود کچھ خاصہ یہی بچا کچا کا فکا، خود سے کسی ایک حد بندی، تفسیر و تفسیر کا بند نہیں رہنے دیتا اور اس کا نام "کا فکا ٹیٹ" ہے۔ اور یہ جو کچھ بھی ہے اس کی ایک سے ناٹھیا تر تفسیر ہو سکتی ہیں۔

کا فکا کی مشہور ترین بیٹی، خود اپنی اور تنہائی کے انوکھے تالی میلنے دھند، اجاڑ پن اور تاریکی کا ایک ایسا اثاثہ مہر تھا ہے جس نے جرمن ادب سے اوپر اٹھ کر چیک CZECH اور لہ آخرا انگریزی زبان کی معرفت عالمی ادبی منزلے پر اپنے گہرے اثاثات شرم کئے۔ کا فکا نے ۱۹۲۰ء میں جرمن ادب کی گستاخوں سے ملنے کی ابتداء کی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔ گستاخوں کا فکا کی معرفت کا فکا کے تنقیدی نگار لگ بھگ ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئے۔ یہ دلیہ سے متعلق بات کرتے ہوئے کا فکا نے کہا:

"شامی ایک مرض ہے لیکن بخار کو دبانے سے کوئی صحت مند نہیں ہو جاتا۔ اس کے برخلاف، بخار کی حوا سے تفسیر اور توجہ ہوتی ہے؟ اس نے تخلیق کاروں سے متعلق کہا تھا: "فن کا کسے نے فن محض کر رہا ہے اور اس کرک کی معرفت وہ خود کو مزید کرک انگریزی کے لئے تیار کر لے۔ تخلیق کار کوئی دیو نہیں جوتا۔ وہ تو اسے وجود کے نفس میں ایک طائر ہے جو دیگر لوگوں کے تعلق میں کم و بیش رنگین ہوتا ہے؟ گستاخوں کا فکا نے خود دوستوں سے متعلق کسی تخلیق کار کا یہ قول کا فکا کو سنایا کہ: دوستوں سے فکا کے ناول جنوں اور پریوں کی کہانیاں ہیں۔ مگر خون میں تری۔

کا فکا نے جواب میں کہا: "جنوں اور پریوں کی کہانیاں نہیں ہوتی جو خون میں تری۔ ایسی جگہ کیاں خون اور دہشت کی گہرائیوں سے ہم جیتی ہیں؟

خود کا فکا کی کہانی نے خون اور دہشت کی گہرائیوں سے جہم لیا۔

فرانز کا فکا ۲ جولائی ۱۸۸۲ء کو پراگ (چیکو سلواکیہ) میں ایک چیکو بوری تاجر ہرن کا فکا کے ان بیٹا، ماما، میکس، براڈ اور ایڈمڈس کے مطابق فرانز کا فکا نے ہمیشہ اپنے تئیم اور قدمے دست مزاج والد کے سامنے خود کو بچا اور بزر در بالا۔ کا فکا کے لئے باپ کی شکل میں

سہی زیادہ باختیار شخصیت **FATHER FIGURE** کا وجود ناقابل برداشت تھا اس لئے والد کے نام لیکر خط میں لکھا:
 ”اگر میں آپ کے اندر سے کل طور پر آزاد ہوں تو چاہتا ہوں کہ میں آپ کے محبوب کا انسان بن جاؤں۔ میں شاید پھر بھی قدیمے مرثیوں میں سا بزدل،
 ہچکچاہٹ کا شکار رہے مگر میں اس شخص بننا بات صرف یہ ہے کہ آپ جیسے ہیں میں بھی ایسا ہی رہتا ہوں۔ آپ میرے لئے کچھ زیادہ ہی قوت مند
 ثابت ہوئے ہیں۔“

لائی کو اپنے بچپن اور دلچسپی کے اس احساس کو کڑی سے ساری زندگی چھٹکا مارنا نہ لایا۔ تپ دق میں مبتلا ہو کر یا احساس مزید بڑھا، نتیجتاً سرد
 اور تاریک کرے اس کی آخری پناہ کا مینے۔ ابتدا میں ادب اور طب سے رغبت رکھی۔

لائی کا پہلی تہمت **THE JUDGMENT** ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ کی رات ظہور پذیر ہوئی جب تہائی اس کے لئے نا
 قابل برداشت بن گئی تھی۔ روزنامہ لکھنے کی عادت اسے لڑکپن سے تھی۔ لائیوں کا لکھنے اس بعد پوری کائنات کو اس کے سامنے اسرار سمیت
 منظر قریب ہی آتا رہا۔ اس بات کا پورا شعور حاصل تھا کہ زندگی گمان منقرض ہے۔ سو اس نے جیتے جی بجتے خواب دیکھے انہیں بعد
 جڑوں کے ساتھ اپنے روزناموں میں اہم بند کر دیا۔

جی۔ مائیونج **J. M. W. Turner** کے نام اس نے ایک خط میں لکھا تھا: ”جب میں لکھ نہیں پاتا تو تہائی لکھتا ہوں۔ احساس مجھے غور و
 کرنے آجاتا ہے۔“

ایسا کیوں تھا؟ یہ جاننے کے لئے اقرار ۱۹ جولائی ۱۸۵۸ء کے نامعلوم اکے روزنامے سے رجوع کیا چلے گا۔ لائی کے کھلے۔
 ”میری تعلیم نے کئی صعوبات میں مجھے سخت غمزدہ کر دیا۔ میرا یہ دعویٰ لوگوں کے انہو کے خلاف تھا کہ میں لکھتا ہوں کہ
 میرے والدین، استاد و شریعت دار ہمارے گھر میں گئے دلمے میں ملاقاتی۔ کئی ملکدار، ایک مخصوص خانہ سال، جو بچے سال ہر
 اسکو لے جاتا اور اساتذہ کا ایک ہی (جنہیں اپنے معاملے میں باہم سختی سے بیچنے رکھنے کی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ یہ صورت دیگر ان
 میں سے بھی کوئی کچھ دیکھتا ہے جو ہر بچے کے لیے ایک نیا گھر بن کر اس طرح باہم بکھینچ کر رکھتا ہوں۔ تو ماں اور انہو ہر صورت رفتہ رفتہ
 کوئی کچھ بچہ کر گھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک اسکول انسپکٹر، آہستہ خام راہ گزرا۔ غرضیکہ کہ دعویٰ ایک خبر کی طرح پورے ماحول
 پر نسبت باندھتا ہے۔ میں اس بات کا اعادہ کر دیا کہ بد قسمتی سے کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس خبر کی کوئی پاک
 اس کے پسینے، اہستہ، باہر نہیں آئے گی۔“

لائی کا جوانی میں تپ دق کا عارضہ لاحق ہوا۔ قانون میں ڈاکٹر ٹیٹ کی سند پائی لیکن اسے بطور پیشہ نہ اپنا سکا۔ اور ایک نیم سرکاری وکٹریٹ انشورنس
 آفس میں کلک ہو گیا۔ ازاں بعد گشتی میرا بھٹ کے طور پر خون تھمتے ہوئے اسے مختلف شہروں کے دورے کئے اور اپنے گھر پہنچا۔
 لینا **MELBURN** اس کی ماں اور ایک زندگی میں واحد روشن ستارہ تھی جس سے طبی تعلیم کی مدت (۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۴ء) بھی خوش اس کی
 اپنی زندگی کی طرح مختصری رہی۔ ۱۹۲۰ء میں لائی اور میس برس کا تھا۔ پیرنگ **PARADEE** میں لینا ۱۹۲۱ء سے اس کی ملاقات ہوئی۔
 ان دونوں لینا اس کی ابتدائی شری تعلیمات کو جرمن سے چیک زبان میں منتقل کر دی تھی اور کانٹاکا کی زندگی کے صحن چار برس باقی تھے۔
 کانٹاکے لینا کو ٹوٹ کر چلا۔ اس کے روزناموں اور خطوط میں لینا کے پورے نام کی بجائے صرف ”M“ کا حوت برتا گیا ہے۔ اور اس ندر
 کی احتیاط یورپ میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

لینا کو ان دونوں ویانا **VIENNA** میں اپنی شادی شدہ زندگی کی تولید کی کا سامنا تھا۔ اور کانٹاکا، پیرنگ میں ۲۰۵
 نای لڑکی سے دوبارہ منسوب رہنے اور سنگن ٹوٹ جانے کے بعد اس جذباتی رفاقت کا منظر جو لینا سے میل ہو جانے پر اسے میرا سکتی
 تھی اس ضمن میں اس نے اپنے روزنامے میں لکھا:
 ”میں ہر کچھ حاصل کر سکا۔ وہ میرے تہا رہنے کا تجربہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد (مکمل ٹوٹ جانے کے بعد) میں کبھی اکیلا نہیں رہا۔
 گلابھی نہیں۔“

بعض اوقات وہ بڑی اجنبی منتقل ہو گیا جہاں سے اس نے محض قلم کاری کی یا محبت کے جوہر تاک انعام کو محسوس کیا۔ اس کے روزنامہ میں اور خط و کا کو بھی
کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ طینا کو دن میں اکثر دو تین خط و در لکھتا اور شادی کو ہمیشہ دعوت فرما پڑتا رہا۔ کانٹا کے خط و لکھتے وقت کبھی دن
اور رات کا کو درج کرنا ضروری خیال نہ کیا اس لئے اس کے مکاتیب کو مرتب کرتے وقت بولی اس کا خط و درجہ سے خط و مال ترتیب میں
کانٹا کے روزنامہ کے لئے اور یوں اس خون اورد ہشت کی داستان کو زمانی ترتیب میں۔

وہ ان دوسری مسلسل خون قہقہہ ردا تھا۔ اور ازدواجی زندگی کے بوجھ کا اٹھانے سے قاصر ایک خط میں اس نے طینا کو لکھا:
”میں ہمیشہ ہر صحت سے اپنے قبضے میں کھینچنے کا خواہاں ہوں۔ اور ان سمتوں میں حسد بھی شامل ہے۔ کاش میں تمہارے خواب گاہ کا دار و دربار
ہو تلخ ہر وقت تمہیں کو ناگوار انداز میں دیکھ سکتا ہے۔“

طینا کے نام ایک خط میں اس نے لکھا تھا:
”اگر کوئی شخص خوشی کے سبب مر سکتا ہے۔ تو میری آرزو ہے کہ یہ سعادت میرے حصے میں آئے، اور اگر کسی شخص کو موت کے لئے منتخب کر لیا
گیا ہو اور وہ خوشی کے سبب زندہ رہ سکتا ہو تو میں یقیناً زندہ رہنے کو تیار ہوں۔“

یکم دسمبر ۱۹۱۱ء کو کانٹا نے اپنے روزنامے میں طینا سے اپنی ہار و زور وفات سے متعلق لکھا:
”طوفانی شہر دہلی میں، چار پر سکون دن۔ سب اس کی ہوائی کبھی نہ ختم ہونے والے غم ناک احساسات کا باعث بن جائے گی۔
اس سے لگے روزہ میرا تھا اور روزنامہ لکھتے وقت طینا کو یاد کر رہا تھا۔“ ”ہمیشہ رہے یا نہ رہے۔“ مگر ایک تاب
ناک اصول تاؤ کی میں ابھرتی ہوئی ایک روشنی۔“

طینا کے نام لکھے گئے آخری خط و اس سے ایک میں کانٹا نے لکھا: ”تمہاری موجودگی تمہاری وفات اور تمہاری محبت کے بغیر میں زندگی
کی کرب و غم، کفایتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا اور نہ دیگر لوگوں کے جو ذکر و رداشت کرنے کے قابل ہوتا۔“

لیکن کانٹا اس قابل کب ہوا یا اس کا ایک ہا ہر قلم اس کے روزنامے اور خط و کرب و غم بے جا رہی، آتا ہٹ، اور خود بھی کی مثال
یہ دینا سے ملنے کی جتنی بڑی خوشی تھی۔ اس سے بھر جھلنے کا غم اس سے کہیں بڑا تھا۔ یہاں تک کہ ۲۲ جون ۱۹۲۴ء میں تب وقت اس کی
جان لے لی۔ کانٹا کی موت کے بعد طینا چھ ماہ میں برس زندہ رہی اور کانٹا پر کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۷ مئی ۱۹۴۴ء کو (شائد) اس سے
جائی۔

موت کی پناہ میں جانے سے قبل کانٹا نے اپنے سوانح نگار، نانا دھرم داس سے ایک خط میں لکھا تھا۔
فریڈرین میکس!

”میری آخری رنانشا میرے ماندہ روزنامے، سوادات، خط و کا کے ذخیرہ، جو میری کتابوں کے صندوق میں، کپڑوں کی ادا ری
میں، گھر اور دفتر کے ڈھلوان میز میں ہیں یا کہیں بھی کوئی تحریر پڑی ہو گئی ہو۔ اور نہیں دکھائی دے جائے۔ اور وہ جلا تقریبی اور کا کے
جی جو تمہارے پاس ہوں یا دوسروں سے میرے نام پر لی گئیں، سب کو بنا پڑے جلا دیا جائے۔“ ہمارا۔ فریڈر۔

فرانز کانٹا کو براگ (چیکو سلواکیہ) کے۔ یہودیوں کے لئے مخصوص قبرستان میں دفنانے وقت میکس برائے اپنے مرحوم دوست
کی آخری فرمائش کو پورا کرنے سے معذوری ظاہر کی اور یوں کانٹا کے گند جانے کے بعد اس کے دوستوں اور حقیقتیں کو اس کی حقیقت کردہ
ناکمل اور سرور شدہ تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ ہڈا آیا۔ جن میں لاتعداد حکایتیں، تمثیل کہانیاں اور افسانے ایسے بھی تھے جو چھ سطور سے
آگے نہ بڑھ سکے اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ زندگی نے کانٹا کو بڑی تیزی سے جگتا دیا اور وقت کا مسلسل گزرنے والی دامن اس کے
ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ گیا۔

کانٹا کے اندر کے جس نقاد نے اس کی تحریروں میں جھلک دکھائی ہے۔ اس سے کہیں بڑھ کر وہ اچھا ناقد تھا۔ اس نے ۱۹ جنوری
۱۹۹۲ء کو اپنے لاڈلے افسانے ”قلب امریت“۔ THE METAMORPHOSIS سے متعلق لکھا۔



عزیز میری چار



راشد جمال فاروقی

دائروں کا اسیر

وہ اک جنونی
چھوڑ کر چھاؤں کی ترکی
کو دبڑا

دھوپ کے بے کراں سمندر میں
گھومنے لگا دائروں میں
شب و روز
گرداب کے مرکز کا متلاشی
ایک ہی جست میں کر گیا قصہ تمام!

کئی دنوں تک
اس کا کوئی سراغ ہی نہ ملا
اور ایک صبح -

بال بچھرائے
کا سر گدائی لئے
دل کے نہاں خانوں میں
ایک نغمی سی خواہش لئے
اپنے سابقہ سسرال کا طواف کرتا
فلسفی نارائن -

بڑھاپے ساختہ
خوشبوؤں کے تعاقب میں
پلاڈھونڈنے
مادر مہرباں کے شفیق سائے
ٹوٹے رہتے استوار کرنے

سلگ رہی تھی شائد کوئی چنگاری
دھڑکنوں میں ابھی سنگیت تھا
ستار کے تار

سب کے سب نہ سہی
کچھ تو محفوظ تھے
آباد تھے!

یہ خبر پڑھ کر ہمارے دور کا جینس لٹشٹ ڈرائنگنگ ڈیٹا رازن کھینچا

یوحین آئینکو کی ہمنوائی میں

بزرگم خود
ہم اپنی عظمتوں کی آخری موج تک ہو کر چلے آئے
کسی نے بھی نہیں روکا ہمیں
اور اس سفیر کے سیم سفر میں
خدا جیسی کوئی کئے ہم نے تو دیکھی نہیں
کیسا خدا!
کیا بات کرتے ہو -
ہم اپنی عظمتوں کی آخری موج تک ہو کر
زمین پر آئے تو دیکھا
لفت رشتوں کے سب الفاظ سے عاری ملی ہم کو
اور اس پرواز سے پہلے
زباں جو بولتے تھے ہنم
پرانی ہو چکی تھی
کوئی کچھ بولتا تھا اور کوئی کچھ سمجھتا تھا
ہم اپنے اس سفر میں
آسمان تو کھوی آئے تھے
زمین بھی دلدلی پائی -

۱۵۷۸ء کی ڈی پی ایل، ماڈرن شپ، یو پی ایڈ (شکاشی) یونی

ایکجہ ۱۹۷۸ء - ہاؤسنگ بورڈ کلاونی، فیروز پور روڈ، لدھیانہ - ۱۰۱-۱۳۱



مہجرت چاؤلہ

INTV LITT, DEICHMANISKE BZLIGTER
HENRIK IBSENS GUT. 2
0179 OSLO 2 NORWAY

شگی ساتھی

تو میں نہیں کہہ دیکھتے ہی دیکھتے ہی ہوا ہو جانیس۔ کھسکتے کھسکتے پھل
دائے کی لاش کی دوچار ضربیں سہنی ہی پڑ جاتی ہیں۔ پرسوں ایک
ظالم قحطانی، پھل دائے نے لاشیوں سے اس بے دردی سے پیٹا
تھا کہ ابھی تک پیٹہ درد کر رہی ہے۔ ذرا ڈھیری پر چڑھ کر دیکھو
تو میری کمر پر ابھی لاشوں کے نشان موجود ہیں۔ مرام نور۔ نور
گلے مرے پھل بھی گاہکوں کے لفافے میں نیچے رکھ کر اپنے پیسے
کھرے کر لیتا ہے۔

مہمانانہ۔ کوئے میاں جی تشریف لے آئے۔ بڑا سراہی والا لڑکے
دیکھنا، تیرے کندھے پر آ بیٹھا ہے۔ اس پر تو نہیں مار مار کر تیرے زخموں
کو کریدے گا۔

”نہیں بیٹا۔ اس صبرے جھنڈا میں کس چیز کی کمی ہے۔ کم از کم
میاں وہ میرا خون نہیں پیتا۔ اور پھر بیٹا، مجھ کو تاثرات دیتا ہے
بڑی تیز نظر ہے اس کی اور بڑا بھائی چارہ ہے اس میں۔ کائنیں
کائنیں کہہ کہہ ہیں اور اپنے سب بھائیوں کو بتا دیتا ہے کہ کون کی
نعمت کہاں چھپی پڑی ہے۔ اسے اکیلے کھانے کی عادت نہیں
چھوٹی سی چیز بھی پالے تو سب کو بلا کر مل جل کر کھاتا ہے۔
”ہاں ماں۔ تم ٹھیک کہتی ہو جس چیز کی طرف میری توجہ
اٹھ جاتی ہے، میرے لئے چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔ مگر
کبھی کبھی میری آنکھ سے دیکھتا ہے تو دل دہل جاتا ہے کہ ظالم
کہیں آنکھ ہی نہ نکال لے۔“

”نہیں بیٹا۔ میاں ہماری پارلیمنٹ میں ہر کوئی اپنی بڑی
عادوں کی نمائش مجبوراً تو کرتا ہے مگر اسے استعمال نہیں کرتا
آخر رہتا تو ہمیں پھر ان ہی درشت انسانوں کے ساتھ ہی رہنا
سانپ کی طرح ہم انہیں دس نہیں سکتے مگر پھر پھر انہیں دکھانے

میں تو سو رہا ہوں مانتا۔ اس نے زندگی کے ڈھیر کی
طرف بڑھتی گائے کی طرف اپنی توجہ تھنی اٹھائی جس میں بچپن کی وجہ
سے ابھی وہ سختی نہیں آئی تھی جس سے اس کے بزرگ اچھے اچھوں
کو کھانسی لیتے یا میدان سے دم دبا کر جگانے پر مجبور کر دیتے ہیں
”جو بول سنبھالتے ہی میری ماں مجھے گندگی کے اس ڈھیر پر
لے آتی تھی اور کہتا تھا، اب تو دودھ پیتا بچہ نہیں رہا۔
میاں امیر گھروں کے پھینکے قسم قسم کے لوازمات کھانے کو ملیں گے
بیٹا عیش کر اور وہ وہ نعمتیں اڑا جن کے لئے حضرت آدم کے
لاکھوں بیٹے اب بھی تڑپتے ہیں۔ مانتا تجھے کیا کمی ہے تو تو انسان
میں دیوی کی طرح پوجی جاتی ہے بکتی خوش قسمت ہے تو، تو کوئی
ہم سموروں کے پیٹ پر لات مانتے میاں آگئی ہے۔“

”رہنے دے عزیز منہ مت کھلوا۔ آج آدم کا بیٹا اپنی
جنی ماں کے لئے تو مہیا کرنا نہیں۔ مجھے کہاں سے کچھ کھلانے کا جس
گھر میں رہتی ہوں۔ اس کا مالک روز اپنی بیوی کے کہنے پر
اپنی ماں کو مجھ پر کتا رہتا ہے اور کبھی کبھی ہاتھ بھی اٹھا بیٹھتا ہے
مجھے تو بس وہ ذرا سے دودھ اور مر جانے پر میری کھال کے
پیسے وصول کرنے تک بال رہا ہے۔ صبح ہوتے ہی میرے گلے
سے رسی نکال کر اور میرے تھنوں سے دودھ کا آخری قطرہ
تک چھوڑ کر مجھے باہر دھکیل دیتا ہے۔ سارا دن ادھر ادھر
منہ مار کر پیٹ کا دودھ بھرنا پڑتا ہے کہیں کسی پھل ولے
لے کیلے کے پھل یا جوس ولے نے گنے یا پھلوں کے پھل
چھینک دیے تو تھوڑی سی عیاشی ہو جاتی ہے یا کسی پھل
دائے کی نظر چھکی تو ایک آدھ سنگترہ، مانا، سیب یا کیلا
منہ میں دبا کر سر پر ڈھونڈنا پڑتا ہے مگر ہم کوئی گھوڑیاں

کھڑے تھے بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ اکثر تو وہ خود ہی جھوٹا رہتا ہے
بھلے کیا دے۔ ہاں اس کی میٹھی میٹھی باتوں اور پیار سے گانوں پر ہاتھ
پھرنے سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ گناہ پیار بہت دکھی ہے۔ بھوک بھی کبھی
اس کے ہاتھوں کے سر میں کسی بھوک کی جھلک بھی نظر آئے گی ہے۔ تو میں وہاں سے
دم دبا کے کھٹک لیتا ہوں۔

”رہنے دے دے دے“ یہاں حضرت انسان کی بات۔ جس دن چاہیے ہمارے
آگے تو سب سے پہلے اپنے ہی کسی بھائی کی پیٹھ میں پھرا گھونپنے لگا۔
”اچھا تم بائیں کرو۔ میں ذرا کچھ کھانے کی چیز تلاش کروں۔“
بھوں، بھوں بھوں۔ کل سے پیٹ میں پوہے دوڑ رہے ہیں۔

”یہ میرے آگے سے تو کھڑا کیوں اٹھا رہا ہے، ننھا سو رہا ہے
پیس بڑھ اٹھا۔“ دیکھ دیکھ ماں، آگیا ناپا ہی کتنی عادتوں پر۔

”اُنے دے آبا میاں کو، ابھی تیری قبر لیتا ہوں“

”کیا بات ہے بیٹے،“ سو رک اتری ہوتی ہے

”چاہا دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ دیکھو تو میرا پیٹ کمر سے
جا لگا ہے۔ بھوں بھوں بھوں۔ ایک ذرا سا کھڑا کیا اٹھا یا ہے کہ
تیرے بیٹے کا دل گھبرانے لگا ہے۔“

”محلن کر دے یاد۔ پتہ ہے،“ پھر سو رہنے بیٹے کی طرف متوجہ
ہوا۔ دیکھ بیٹے۔ یہاں مل جل کر رہتا ہے۔ بھرا کھنڈا ہے اور پھر
تو تو سو رک کی اولاد ہے۔ تیرے لئے کھانے پینے کی کیا کمی ہے۔ ہم لوگ
یکے اور زندگی بھی چاٹ کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ یہ راجہ لوگ ہیں، ننھیں
کھانے کی عادت ہے۔“

”چاہا تو بھی طنز کر رہا ہے۔ کیا ملتا ہے یہاں۔ بس پیٹ کا دھڑ
کسی طرح بھر لیتا ہوں۔ بھوں بھوں بھوں۔“

کوئے نے کائیں کائیں کہ کے سو رک کے بچے کی توجہ دوسری طرف
مبذول کی۔ جہاں کوئی سفید شیوہ ترا سا ڈھیل ڈھالا اخبار سا کسی
نرم نرم سفید ملائی قسم کی چیز سے بھرا ہوا پڑا تھا۔ سو رک نے تھو تھوئی اور
موڑی ہی تھی کہ مرغی نے بھیت کمر خوارہ اپنی طرف کھینچ لیا

”بڑا کڑا۔“ وہ بولی۔ یہ تیرے مطلب کی چیز نہیں اس میں حق
انسان کا بچہ قید ہے جسے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس گندگی
کے ڈھیر کی نذر کر دیا گیا ہے وہ میرے آدے کے بچوں کو بھونڈا کرتا
کر پٹ کر جاتا ہے میں اسے قطرہ قطرہ پوسوں گی۔

اس سے مجھے تھوڑی سی تسلی ملے گی کہ میں نے بھی اپنے

کا جھوٹا رعب تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے ان عادتوں کی پرکھ
کہتے رہنا چاہئے۔

”یہ تو چاہا کتا بھی تشریف لے آئے۔ اب ایک آدھ بھوک
مجھے ماریں گے، تھوڑی طرف پکیں گے۔ جو بھی کوئی اچھی چیز
نظر آجائے فوراً بھست کر ایک طرف جا بیٹھیں گے جیسے اس سدا
سلطنت کے وہ ہی اکیلے بادشاہ ہوں اور ہر اچھی چیز پر مطلق
ان کا ہو۔ جب آبا جان یا انکی حضور میرے ساتھ ہوتی ہیں تو
میاں جی نے ذرا اس آل کی اور آبا حضور نے تھو تھوئی دکھائی
بس پھر تو ان کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور دم دبا معصوم صورت
بنا ایک طرف ہو جاتے ہیں۔“

”بیٹا۔ تم ابھی نادان ہو۔ تم کیا جانو، اس کے ساتھ
کیا جتنی ہے۔ بچا را سارا سارا دن ایک ایک کھڑے کی تلاش میں
مارا مارا پھرتا ہے۔ جگہ جگہ انسانوں سے دھتکارا جاتا ہے
بچوں کے پتھر کھاتا ہے۔ یہاں شہر میں تو یہ اونچی آواز سے
بھونک بھی نہیں سکتا۔ ہاں رات کو ذرا کھا صاف کرنے کو
تھوڑی بہت بھونک مار لیتا ہے۔ وہ بھی دراصل بھگوان
کے جھرے دربار سے بھوکا رہنے کی شکایت ہوتی ہے۔ دیکھتے
نہیں، رات کو اس کی بھونک کس طرح منہ آسمان کی طرف
کمر کے اوپر والے سے شکایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ بچا را
ہماری طرح سو کھی مٹری گھاس سے بھی تو پیٹ نہیں بھر سکتا
ایک بار شیر بادشاہ کو آنکھ دکھائی تھی تب سے جنگل سے
دیس نکالا مل گیا۔ اب بچا را انسان کے جنگل میں آچھنسا
اس کے تلوے چاٹ چاٹ کر ایک آدھ کھڑا حاصل کر لیتا یا بھوک نظر
سے اُس لگائے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔“

بھوں بھوں بھوں۔ نسا کر مانا۔ کیا بات ہے آج تو عزیزم
سو رک سے جڑی گہری بائیں ہو رہی ہیں۔

”تیری ہی بات ہو رہی تھی بیٹا۔“

مجھ سے میرا کمر اٹھا ہے جو اس محض میں ہے۔ بھوں بھوں بھوں
”آج تو میرے شعر اتر رہے ہیں میرے لائے پر۔“

”وہ ماں، دراصل آج کل مجھے میں ایک شاعر آیا ہوا ہے
اس نے ایک جھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لیا ہے۔ وہی کبھی پاس بٹھا کر
ایک آدھ شعر سنا دیتا ہے اور اس کے شعر سننے کے بدلے ایک آدھ

دشمن جاں سے کسی طرح بدلے لیا۔

سورہ کچھ رو ہنسی آواز میں بوللا۔ ابا جان ۔

”مہنے دے بیٹے۔ مای مری ٹھیک بنتی ہے۔“

”چھوڑ دو کچھ اپنے دکھوں کا رو نہ بہت ہو چکا۔ آؤ ذرا ادھر لگا

کی۔ حضرت انسان کی باتیں کریں۔ یہ اوپر سے چلنے دیکھنے کے پڑاوا

اور بڑے بڑے مخلوق میں رہنے والے انسان اندر سے بہت دکھی

اور دکھ کھٹے ہیں اور یہ دکھ انہوں نے خود ایک دوسرے کو بتائے ہیں

درد بھگوان نے تو بہت خوبصورت دنیا بنا کر انہیں بخشی تھی۔

اچھا چھوڑو، ایک لطیفہ سنو۔

اس دن جب تم سب لوگ ابھی یہاں نہیں آئے تھے اور

میں اکیلے کھڑی تھی۔ یہاں سے دو دوست گزر رہے تھے مجھے دیکھتے

ہی ایک کو مذاق سوچا۔ بولا۔ گائے ہماری مانتا ہے، بیل ہمارا

پتا ہے۔۔۔ تھی ادھر سے ایک بوڑھے میاں بیوی کا گزر ہوا۔ ایک

طرف میں اور یہ باب بھرا ہوا گندگی کا ڈھیر۔ دوسری طرف چوڑی

دھکان داہنے اپنے الم غلم سامانوں سے آدھانٹ پاتھ تک گھیرا

ہوا اور ٹھک بھرا ایک ٹرک کہے تماشا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ دونوں

میاں بیوی اس کی زد میں آئے ہی دالے تھے کہ مذاق کرنے دالے

چھوکرے نے تبرعیا کو کندھوں سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچ کر ٹرک

سے ٹھکرانے سے بچا ہوا۔ بولا۔ مالا دیکھ کر چلا کر۔ ابھی کچل جائیں

تو۔ دوسرے نے ہنس کر کہا، مالا کا بہت خیال کہ تہ ہوا دھر اپنے

باپ کو بھی دیکھ لینے، پکارا مرنے مرنے بچا ہے۔

لطیفے پر سب کھل کر ہنسنے لگے مگر ہنسنے ہوئے تو بے کائیں

کائیں کہیں کہیں بن گئی۔ اس کے بیٹ میں کئی بل پڑ گئے جس سے

اس نے خود کو گائے کی بیٹھ سے گرنے سے بچانے کے لئے بچے

ددا اور مضبوطی سے گاڑ دیئے۔ اس کے بچوں کی جبین جب گائے

کو اپنی زخمی کھال پر محسوس ہوئی۔

نوہول۔۔۔ اب نیچے اتر میری تو کھال پھیل ڈالی ہے تو نے

گتا ہے آج تو نے کہیں سے اچھا داؤ مارا ہے۔ بیٹ بھرا ہوا ہے

تیرا، جو نیچے اترنے کا نا ہی نہیں لیتا۔

”ساری مالا، آئی ایم ویسی ساری۔ کائیں کائیں کائیں۔“

کنا آکر ڈھیر کو چھپانے والی ایکشن کے دنوں میں علاؤ کو نسل

کی بنو اتنی بچو کو رد ہوا دونوں میں سے ایک کی منڈیر پر چا بیٹھا

”آج کل وہ سیٹھ کا شاہ کی بلڈنگ بن رہی ہے نا۔ وہاں بیٹھا تھا

سرواد ٹھیکیدار مرے کی ٹانگ پر سوار تھا ساتھ نمبر میسٹری سے لہرے

بھی جا رہا تھا۔ منہ میں ہلکی، دائرہ می تو فیکوں کا گھنا غبار۔ اس کی

بات چھٹس چھٹس کر رہی تھیں کہ باہر نکل پاتی تھی۔۔۔ ستری جی۔

ایٹور میں تو لاکھ لیک کا گھلا کر ہی دیا ہے۔ سیمٹ میں ریت کی

مقدار فدا زیادہ کر دو تو تھوڑا ادھر سے بھی۔۔۔ میں غریبوں کا

حق نہیں مانتا، تمہارا حصہ ہر میلے کا حکمران کرنا، میری نظریں

تو بوٹی پر لگی تھیں، دماغ دوسری طرف لگا تھا، اس کی باتوں کا

ساتھ کیا دیتا اور نہ باتیں نواس کی ہر پھیر لوں کی اور بھی بہت سی بولی

تھیں۔ جو وہ اپنے منشی سے کر رہا تھا۔ جوں ہی وہ کوئی کاغذ لکھتے

کو اپنے برقع کیس کی طرف مڑا اور میں نے مارا جھپٹا، اچھی مٹی

سی بوٹی اڑا کر اوپر بھرت پر چا بیٹھا۔ بڑی شاہانہ دعوت اڑائی۔ بس

آپ جگہ دو باتیں کہنے چلا آیا۔

”ہنس تو ایسے رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑا لطیفہ سنانے جا رہا

تھے۔ کھوڑا ہوا، نکلا چوا۔ ارے ایسی باتیں تو یہاں راجد صافی ہیں

راجہ توگوں کی ٹانگ تلے ہر روز سننے کو ملتی ہے۔“ کتا بولا۔۔۔

سانا ہوں لطیفہ۔ اس دن سیٹھ مجھو مل کے ہاں دعوت تھی۔ باہر

بڑا شانہ رنگ رنگ شا میاں لگا ہوا تھا۔ قریب ہی کچھ غریب لوگ

بھی باہر ایک آدھ ٹکڑا پھینکے جانے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں

بھی ان کے ساتھ اس لگائے کھڑا تھا۔ وہ دالیں بہانے، ہاتھ بٹہ

بھوکا نکلا پیٹ دکھانے آئے بڑھتے تو میں بھی ساتھ کھسک لیتا

اس دن میں، وہ جو باہر ادھر باغ کے سامنے کئی منزلہ بلڈنگ

بن رہی ہے نا۔ وہاں مزدوروں کے لئے پانی کی ٹوٹی لگی ہوئی

ہے۔ اسے خالی دیکھ کر فدا اشران کرنے کو دل کرا یا تھا اور میں

خوب جی بھر کر نہایا تھا۔ جسم کو جھٹک جھٹک کر صاف کیا تھا۔ کھال

تو تم دیکھو نامیری، کتنی سندرا اور سنہری ہے۔ بس میں چمک ہی تو

اٹھا تھا مگر بیٹ کی پکی ہوئی بھوک تو کچھ اور مانگتی ہے۔ ادھر دھن

کی اشتہا اور خوشبوئیں بھی بے چین کئے دے رہی تھیں۔ قسمت

کی خوبی دیکھئے کہ میں ایک پانچ چھ سالہ لڑکے کو ایسا بھایا کہ وہ مجھے

میں سیٹھوں کی محفل کے درمیان لے گیا۔

”بہت لمبی کتا ہے۔۔۔ سو بولا۔۔۔ وہ تیرا لطیفہ کہہ گیا

”یار تو بیچ میں اپنی تھوٹھی مت اٹکایا کر۔ بھول بھول بھول

سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔

اتنے میں دوسرے ایک آدمی سائیکل پر ادھر ادھر جڑے
بڑے بوری کے جھولے لٹکائے آہستہ آہستہ ان کی طرف آتا ہوا
دکھائی دیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا تھا۔

”لو شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر۔“ اے ڈھیری کے
قرب آئے دیکھ کر سو رہا ہوا۔ ”سارے کو ڈال دوں لہذا تھوٹھنی کے
ایک ہی داسے۔“

کتنے تو اس کی طرف باقاعدہ منہ کر کے جھونکنا بھی شروع
کر دیا۔ ”جھوں جھوں جھوں۔ نکال لاؤں اس کی ٹانگ سے ایک
سوئی سی گوشت کی ہوتی۔“

مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حملے کی تدبیر سوچنے۔ وہ خود
ان سے چند قدم دور سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر کے پاؤں کے
بل نہ زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ لٹکے کی ناراض نظروں کو سچا منہ پہنڈ
میں بولے جا رہا تھا۔ ”بھائیو۔ میں تمہارا حق مارنے نہیں آیا۔ تم
کھاؤ پیو موز کرو۔ میں انتظار کر رہا ہوں گا۔ کاغذ تو تم کھا نہیں سکتے
میں انہیں بعد میں ہن لوں گا۔ تمہاری میری روٹی روٹی کاٹو گیں
ٹکراؤ ہی نہیں۔“ اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے ایک کونے میں بیٹھ کر
میری پیٹے اور پھر سے بڑبڑانے لگا۔

”بڑا حرا ہی ہے سیٹھ جگمومل۔ ریٹ میں بھی مارتا ہے اور
وزن میں بھی۔ دس کلو کاغذ مول تو مارا ایسی ڈنڈی مارے گا
کہ آٹھ کلو بن جائیں گے۔ ایک بار اس کے تولیہ پر اعتراض کہتے
ہوئے میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ وزن تو نہ زیادہ ہے۔ دو کلو
جگم سے تو اکڑ لایا ہوں تو بولا۔ پھر اسی جگم ہی دے دیا کہ وہ
حرام زادے۔ میرے دھرم کاٹنے پر شک کرتا ہے۔ اس دن
اس نے میرے کاغذ نہیں لئے تھے۔ مجبوراً مجھے ایک دوسرے
کباڑے کے پاس جانا پڑ گیا۔ ایک حرا ہی تو دوسرا مہاں حرا ہی۔ وہ
بولا تھا ہم اپنے کسی کباڑے بھائی کا دھندہ خراب نہیں کرتے
آج میں تمہارا مال خرید لوں تو وہ کیل میرے گاہک تو لے لے گا
غیر تم بڑی آس لگا کٹائے ہو تو لے لیتا ہوں گاہک واپس بھی
اس کے ہاں مت جانا۔ ورنہ تمہاری وجہ سے ہمارا جھگڑا ہو
جائے گا۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر کہنے لگا۔ پہلا روپے میں اتنی
پیسے تو دیتا تھا یہ سالا ساٹھ پیسے دینے لگا۔ میں کیا کرتا، واپس

”کٹنا اس کی طرف غرایا۔“ سیٹھوں میں جیسے چلنے، پھر چلنے
ملاوٹ کوٹنے، سرکاری سامان خرید کر دینے، رشوتیں دے کر دھور
عورتیں سپلائی کر کے کام کروانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں سے
ایک بولا۔ یار جگم۔ آج کی تیری دعوت بڑی شاندار ہے۔ شروب بھی
تو آج اصل ولا تھی پلا رہا ہے۔ لگتا ہے کہیں سے ٹکڑا دو مل رہا ہے
ہاں یار۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ سیٹھ بولا۔ مگر اب تم تفصیل مت پہنچانا
دوسرا دوست بولا۔ یار ہم تو پراسب کچھ تجھے بتائیے ہیں اور تو
پھیسا رہا ہے اپنی کرتوتوں کو۔ وہ بولا۔ یار تو موج اڑا، کیوں مجھے
گندگی میں گھسیٹا ہے۔ پھر بھی تو کچھ جھٹک ملے۔ تو کباڑی ہے
تمہاری ہماری لائیں ہی جدا ہیں مجھے فکر کس بات کی ہے۔ کبڈ
خانے میں یہ پرہیاں ۹۔ دوست نے پھرے کی پلیٹ میں سونے
کے پانی بھیسی دھسکی سے پھرے جاموں کی طرف اشارہ کیا۔ یار
پرج پرج تا معاملہ کیا ہے۔“

”بس کباڑ کا ہی مال کھ لے۔ کباڑی سیٹھ بولا۔“

”کمال ہے کباڑ میں سے سونا تلاش کر نیوالے تجھے پر لاکھوں
سلا۔ پھر بھی۔“ ایک اور نے سوال کیا۔

”کچھ تو تیرے چلنا چاہئے۔“ سب بغض ہو گئے۔ تم فکر مت کرو
ہم میں سے کسی کا کباڑی بننے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ اس پر سب غوب
پٹنے۔ ”تو سنو بھائی۔“ کباڑی بولا۔ ”یہ جو تم سب کچھ کھا رہے
ہو یہ سب چینی کی کٹائی ہے۔ یہ سن کر سب کے منہ پھینکے پڑ گئے
جیسے نے کہنے سے پہلے پھرے کا رنگ بدل جاتا ہے مگر وہ بنا کر
کہتا گیا۔“ میں نے ایک جھگی جھونپڑی علاقے میں ایسا بندوبست
کیا ہے کہ سب پانچاڑوں کا تازہ تازہ مال میری فیکٹری میں آجائے
ہے۔ علاقہ کو نسلہ خوش ہے کہ میں نے سب گندگی سب خال کر
اور اس کا کام ہلکا کر کے کالونی کے سب مکینوں کے دوش
اُسکے لئے کھڑے کر دیئے ہیں اور میں خوش ہوں کہ فیکٹری کی کھا
میرے لئے سونا روٹنے لگی ہے۔“

وہ ہاں۔ سنا ہے کچھ کباڑی اب ادھر دھیان دینے لگے
ہیں۔ سارے ہمارے پیٹ پر لٹ مارتے چلے ہیں۔“ سو رو کو
فخر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی ٹیڑوں میں منہ مار لیتے ہیں تو حضرت
انسان کے رات بھر کے کھانے پینے کا مزہ آجاتا ہے۔ اب اس
سے بھی جائیں گے۔ ڈرتا ہوں کل خلائ گندگی کی اس فیکٹری

تو جانیں سکتا تھا۔ ادھر بڑی ہے کہ پانچ سال سے بیمار پانی سے لگی پڑی ہے۔ ساری دولتیاں اس کے اندر سے بے اثر گزر جاتی ہیں۔ ٹھیک تو کیا خاک ہوگی بس زندگی کے دن پورے کر دی ہے۔ مرقی بھی نہیں دکھ پا رہی ہے، دکھ دے رہی ہے۔ بڑ بڑا ہٹ میں اپنے ہی اندر کی دنیا میں گم وہ بیڑی کو کش لگنا بھول جاتا اور جب آگ اس کی انگلیوں کو چھونے لگتی تو وہ دوسری بیڑی سلگالیتا۔ میں کروں بھی تو کیا۔ اس نے دکھ دکھ میں میرا ہمت ساتھ بچایا ہے۔ جب میں بیمار پڑا تھا اور جب اس کے ہاتھوں سے ابھی شادی کی مہندی بھی نہیں اتری تھی وہ ایک سیٹھ کے گھر برتن بھانڈہ اور بھانڈے کو پچھ کا کام کہنے لگی تھی۔ میرے منہ سے تو اس کی موت کی بات نکل جاتی ہے۔ بچاں ہے جو اس بیماری نے میری موت کے بارے میں سوچا بھی ہو بلکہ جب کبھی بیماری سے تنگ آکر میں مرنے کی بات کر بیٹھتا تو میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں۔ وہ اپنی خوبصورت جوانی میرے لئے نگاہ رہی تھی۔ آخر اس کی جوانی اور خوبصورتی ہی اس کی مصیبت کا کارن بن گئی۔ ایک بار وہ سیٹھ کے مہاں کام کرنے گئی تو بیٹھانی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اس نے کچن میں برتن دھوئے شروع کئے ہی تھی کہ سیٹھ نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے عزت بچا کر وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ جب وہ جھونپڑی میں پہنچی تھی تو اس کی بھانجی دھوکنی بنی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا تھا۔ کیا ہو تو بولی تھی۔ جراثی سیٹھ میری عزت کو مٹا چکا تھا بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ آئی ہوں۔ اور وہ زار و قطار دوڑنے لگ گئی تھی۔ مجھے اتنا غصہ آیا تھا کہ ٹکڑیاں پیرنے والی کلہاڑی اٹھائی تھی۔ غصے سے پاگل ہو کر میں باہر کی طرف لپکا ہی تھا کہ اس

نے میرا پاؤں پکڑ کر روک لیا تھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ تم پیار ہو، بھگت اموں مت لو۔ جھگڑا بھی تو ہم نے اس کے بھائی کے ملاٹ پر ڈال رکھی ہے۔ بھائی کی ہمدردی میں وہ ہمیں دودھ کی ٹھکی کی طرح باہر نکال کر چھینک دے گا۔ بس دو تین سال صبر کرو تو یہی سے اٹھتے اٹھتے سیٹھ سے دو تین ہزار روپے لے کر رہ گئے اور دو تین ہزار روپوں کے لالچ نے میرے تمام غصے کو سوڈے کے بال کی طرح واپس اپنے ہی قدموں میں بٹھا دیا تھا۔ واہ ری خربہ تیرا غصہ بھی سوچ کے ماتحت ہے۔ ہم تو سنستے تھے، غصہ آتا ہے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے، مگر غریب کا غصہ لٹا اس کی آنکھیں کھول دیتا، وہ صبر سے بیٹھا بڑ بڑائے جا رہا تھا۔ اس کے دکھ کی کہانی سن کر مجھے کی متا جاگ اٹھی تھی۔ پکارا ہماری طرح آدم زاد کا ستایا ہوا لگتا ہے۔ وہ بولی تھی۔

”جھوں جھوں جھوں۔ اپنا ہی بھائی لگتا ہے۔ کتا بولا اور ساتھ ہی اٹھ کر اس کے پاس دم ہلاتے ہوئے آ بیٹھا۔ آدمی نے پیادے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”موتی، میرے بچے، وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کتے کو لے اپنا بچہ گھنا بہت اچھا لگا۔ وہ دم ہلاتا اس کے پاؤں چاٹنے لگا پھر اٹھ کر آگے آگے چلا اور خطر کر دیکھتا اسے اپنے ساتھیوں کے درمیان لے آیا۔ گائے نے پیادے سے اپنی ٹھونکی سے اس کی بانہہ کو چومنا۔ پیادہ کی زبان جھٹا وہ اور آگے بڑھ آیا۔ سور نے ایک طرف ہٹ کر اسے ڈھیری میں آنے کی دعوت دی۔ جڑی کوڑ کوڑ کر کے ایک طرف کرنے میں چلی گئی۔ اب وہ ان کے ساتھ گندگی کی ڈھیری سے اپنا رزق تلاش کر رہا تھا۔ ❀

کہ ادب نے فنا کے تصور سے ہمیشہ زندگی کی حرارت حاصل کی ہے اور فنون لطیفہ کے تمام اثنائی روپوں نے اسی سے جنم لیا ہے لیکن اول و آخر فنا تصور زندگی سے فراکانام نہیں، زندہ رہنے کو شدت سے محسوس کرنے کا نام ہے۔ اس وقت دنیا کے عظیم ذہن سماوی دنیا میں موت کا تصور پیدا کر اپنی دانشوری کا لوبا منوانے میں مصروف ہیں کیا ہمارا ادب اور تخلیق کار اس سلسلے میں کوئی نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں؟ یہ مخالف ہوا کے سامنے چراغ روشن رکھ سکتے ہیں۔ ادب کو فیشن پرستی اور تقلیدی روپوں کے بجائے ایک نئی جہت عطا کر سکتے ہیں۔ امن عالم کے انسانی دوستی کے لئے، قوی کجی کے لئے، مساوات کے لئے، معبود فن کو سرخی عطا کرنے کے لئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ادب پر تنقیدی مکالمے ہوں۔ ہر ایک دہائی کے ادب کا محاصرہ ہو، اکیسویں صدی سیماب مفت تخلیق کاروں کی صدی ہے۔ ہم اپنی زبان، اپنے ادب، اپنے ذہن اور اپنے وجود کو سیماب صفت بنائیں اگر توگ اس سے ناراض ہوں تو صبر کیجئے مگر مکالمہ جاری رکھیں۔

زندگی عبادت ہے خود نئے اجساروں سے یوں بھی ڈوب جانا تھا ڈوبتے سنا رہی گو۔ ❀

زندگی عبادت ہے خود نئے اجساروں سے



معصوم انصاری



محسن جلکانوی



رشید امکان

سبز موسم میں کہاں سے آگئی پسیلی ہوا
دس گئی بننے ہوئے پھولوں کو زہریلی ہوا

ڈھونڈنے نکلے ہوتے فرد ہیں گم گشتہ سماں
گمزدے اندھا کہیں صحرایہ ریشمی ہوا

خون بہتا ہے، نہ کوئی زخم کھلتا ہے کہیں
کاٹی ہے اس طرح جسموں کو برقیلی ہوا

راکھ ہو سکتا ہے سارا شہر، میرا گھر ہی کیا
ہے بہت اس کے لئے ماچس کی اک تیلی ہوا

دشہ شب میں کون میرا ہم سفر ہے دیکھ لوں
کاش اک پل کے لئے ہو جائے چمکیلی ہوا

ایسا لگتا ہے قیامت اب بہت نزدیک ہے
رقص کرتی چھوڑ دی ہے ہر طرف نیلی ہوا

گھر جے نصرت تھے معصوم آنکھیں خاک میں
داؤی احاس میں جہالتی دی گیلی ہوا

● ۱۹۸۹ ہمارا ماٹھ، فوجیہ نظام پورہ، بھینڈی

گھر سے نکل بھی آئیں مگر یاد بھی تو ہو
جی کوئے کہیں کوئی کردار بھی تو ہو

یہ کیا کرے برگِ زرد ساوٹے بکھر گئے
ہندھی چلے ہولوں کی یلغار بھی تو ہو

سر کو عبث ہے، نگ قاتر کا سامنا
صحنِ مکاں میں شاخِ ٹر بار بھی تو ہو

انمول ہم گہر ہیں، مگر تیرے واسطے
بک جائیں تیرے ایسا خریدار بھی تو ہو

کاغذ کی کشتیوں میں منہ پلٹ لیں
پہلو میں تیرے قرب کی دیوار بھی تو ہو

ہم کو نہ جینے دیگی تری لبِ خوشیاں
افرادِ نرِ پائے تو، انکار بھی تو ہو

سب کو مٹی کے لہجہ کی توجیہ چاہیے
محنت کسی کو مسترِ سازگار بھی تو ہو

کیوں کوئی اپنا ہم سفر بھولے
بھول سکتے تھے جس قدر بھولے

اب تو کچھ یاد ہی نہیں آتا
اتھ محسوس کہاں پسر بھولے

ایڑیوں میں ٹھکی ہوئی کیلیں
یاد رکھنا تھیں ہم مگر بھولے

اُس کی آنکھیں اتر گئیں دل میں
کھبتانے سے پیشتر بھولے

وہ جگہ خشک رہ نہیں سکتی
ہم جہاں اپنی چشمِ تر بھولے

● ۱۹۸۹ کوپ خانہ روڈ - محبتین (ایم پی)

● ۱۹۸۹ ریڈیو کارٹرس، لاہور گھڑ سکنڈ آباد ۱۷-۵۰۰۰



حسنہ عثمانی
۱۰۰۱ تا ۲۲۲۰ - اسلام آباد (پاکستان)

کابوس

کے تین نقش پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ گول چہرہ اس پر گھولوں میں ڈھیل۔ تھوڑی سی ڈھیل، گہری گہری چروہیں آنکھیں، سمجھوڑی طرح کھینچی ہوئی، جو خود سے دیکھنے کی دودھتا ہائے مائولے رنگ پرناک کے چنگار کوکے کی عجیب ہما بہا ہمتی ایک لمحے کے لئے تو وہ بہت ہو گیا۔

لوک کے ہاتھ میں بہت سے کارڈ تھے۔ جو اس نے مسافروں میں بانٹنے شروع کر دیئے پھر اسی طرح کارڈ واپس لیتے ہوئے اس کے پاس آگئی وہ بیٹھ کر بھکاریوں کو کھینچ دیتا تھا لیکن اس لوک کے لئے اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی جیب میں گھس گیا۔ اس نے ایک روپیہ نکال کر کارڈ پر رکھ دیا۔

مگر اس وقت اسے لالکے نے عجیب حرکت کی۔ اس نے کارڈ واپس لوٹنے کے بجائے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لوک نے کارڈ ہٹانے سے چھوٹا پھر چھوڑ دیا۔ اس نے غصے سے لالکے کے ہاتھ کو دیکھا۔ کارڈ کے نیچے سے سرخ رنگ کی جھلک گہری تھی۔ یقیناً سوکا ٹوٹا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ لوک نے کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے جیسے یقین کے ساتھ خواہش کی۔

”یہ پیش کش مسترد ہو جاتی چاہئے“

لوک شاید کی فیصلے پر پہنچ رہی تھی۔ اچانک اسٹاپ آگیا۔ لہجہ کی تو لوک نے اظہارِ رفا مندگی کے لئے ہلکا سا اشارہ دیا اور جلدی سے اتر گئی۔ لاکازیر لب مسکرایا اور اس کے پیچھے پیچھے اتر گیا۔

درد کی ایک بردل سے اٹھی ہوئی آنکھوں تک آنی اور ہلے بھر میں بلیک جگڑ گئی۔ وہ بہت دور تک ایسے دیکھتا رہا ”کیا مجھ پر ہی تھی اس لوک کو... شاید... لیکن... جواز... جواز... ہر جگہ یہ کجعت جواز... اس نے زور سے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ ساتھ میں نے مسیختے دلے

کتنی حد تک سے سب کچھ ایک جیسا تھا، ایسے سیم وزر کے انبار پر کچھ کھسکا دریدہ چادر کے تار۔ کیس چاہے دشمن کی حالت دامن پر غور نہ تھی کے پیچھے، ایسے سمجھوڑا کے آگے غصے کی سرنگوتی، ایسے کھدکے سے جھلکتی چاندی، ایسے فضا میں ہر فرد اسٹاپ ہوئے غن آلود ہاتھ کہیں جھوک کر برہنہ پاؤں، ایسے مجھوڑی کی سہلے ہانکا...

ماحول کی ایک رنگی کو سہمہ سہمہ کردہ سرتا پھلتی ہو چکا تھا۔ ہر صبح پرانی جنموں کے ساتھ طرح ہوتی پھر دن بھر برس برس کے دیکھے ہوئے خطر اس کے آگے سے گزرتے رہتے لیکن ان کی شدت کبھی کم نہیں ہوتی تھی۔ اکثر اوقات ایسے ہوتے کہ ان کے دیکھے سے دل میں درد کی ایک ہراٹھی جوا آنکھوں تک آتی ہوئی پلکیں جھگوڑاتی۔ اگر اس کے ہوس میں ہوتا۔ لیکن یہی تو مشکل تھی کہ اس کے ہوس میں کچھ نہیں تھا۔ جڈوں کی سرنگوتی۔ نا فاقی کے بوجھ تلے دب کبے دم ہو گئی تھی اور ارادوں کی صلاحیت کو بجزاری کی دیکھا جا رہا تھا۔

پھر بھی ایک ایک تھی، ایک ہلک تھی۔ وہ دن چڑھتے ہی ٹھہرے تھل جاتا پھر وہ ہوتا اور شہر کے کوچہ بازار۔ دھوپ کی کوٹھ، تندیلی بدلتی اور دھیرے دھیرے مٹھنے ہو کر شفق کی سرخی میں ڈھل جاتی۔ دن بھر وہ گھومتا رہتا... گھومتا رہتا... اور شام گئے زخمی آنکھوں سے شہر کے سارے تہاڑوں میں لوٹ آتا۔

اس روز بھی وہ حسب معمول پھرتا پھرتا ایک بس میں سوار ہو گیا۔ ایک نشست خالی تھی وہ اس پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ والی نشست ایک لڑکے نے آکر پُر کر دی۔

ایک اسٹاپ پر بس رکی تو پچھلے دروازے سے ایک نوخیز لڑکی بس میں سوار ہوئی قدر سے جھلا باس، گرد آلود جوتیاں لیکن اس

عمر خردوں کو جو اہر بنایا اور چپ چاپ اپنی جنت کو نہانے سناٹے میں
چھپی ہو گیا۔

اس بات کو بہت مدت نہیں گزری تھی کہ اخباروں کی سرخیاں
درد کی بنا دی بننے لگیں۔ واقعہ یہ تھا کہ لوگوں کے منہ کو خون لگ گیا تھا
وہ ایک دوسرے کا دھڑکے مکانوں سے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے
اندر کا خوف آتش دہشت کی عورت ہاتھوں میں نودار ہوتا اور ایک دوسرے
کا گریبان پکڑ کر اپنا خوف دوسرے کے سینے میں منتقل کر دیتا۔

کوال و جواب کے سب سلسلوں سے قطع نظر اب فضا میں ایک
ہی بوجھ تھی اور وہ خون کی بوجھ تھی۔ زمین اب باران آب کے بجائے ہمو
کے دھاروں سے میرا ب ہوئی۔

اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا کہ وقت کی گردش نے کہاں لاکر کھڑا کیا ہے
یہ کون کونسا ہنر میں استعمال ہے کہ آنکھیں ساکت ہو گئی ہیں۔ ہاتھ پاؤں
بے دم اور زبانی خاموش۔ یہ قاتل طحہ جواب پھیل کر ماہ و سال کی صورت
اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کیونکہ ہمارے نصیب میں کچھ دیا گیا ہے۔

اس کے خورد خوک کا سلسلہ جو پہلے ہی قاتل کی تنگ پھیلا ہوا تھا اب
اور بھی پھیلنا جا رہا تھا۔ لیکن اپنی تمام تر درد مندی کے باوجود کبھی کبھی
اسے یوں گن جیسے وہ بھیڑیوں کے ہجوم میں گھر گیا ہے جہاں ہر طرف
تھو تھیل نکلتے، ایک دوسرے کی بوٹینے ایک دوسرے پر غرگتے
بھیرے گھوم رہے ہیں اور وہ ان کے درمیان یکدہنا اپنی جنت بھارتے
کھڑا ہے ایسی حالت میں کہ اس کا قد آسمان سے ہاتھ کر رہا ہے۔

اب تو کچھ دنوں سے یہ ہونے لگا تھا کہ اخبار پڑھتے پڑھتے
یار یار یو، ٹی وی پر خبریں سنتے سنتے درد کی ایک ہرا مٹھی جو آٹھواں
تک آتی ہوئی ہلکوں کو بھوک جاتی.... لیکن اس کا قد جو آسمان سے
ہاتھ کر رہا تھا.... ایک معمولی صبح کو وہ غیر معمولی طور پر اخباروں کی
ذہنت بن گیا۔

”ماجھی کا کہن کا پر اسرار قتل۔ نامعلوم قاتل فراہ۔
پوسٹلے رپورٹ درج کر کے تعین متور کر دی....“

اپنا زرسالانہ وقت پر ارسال کیجئے

شاعر کی توسیع اشاعت میں تعاون دیجئے

نے چونک کر اسے دیکھا، ”کیا ہوا جناب؟“ ”کچھ نہیں“

اختل متعل سامنے کے ساتھ وہ گھبرایا، ”کیا کہوں؟ کیا نہ کہوں؟
بس اب آخری فیصلہ....“ لیکن آخری فیصلہ کب ہو گا؟ آنکھوں کے چنے
کب تک رواں رہیں گے؟

جذروں کی سرکشی کب تک طاقت کے بوجھ تلے دبی رہے گی؟ ارادوں
کی صلاحیت کو بیزاری کی دیکھ کب تک چلتی رہے گی؟ کب تک؟
کب تک؟

اپنے آپ سے لڑتے لڑتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں
کیا دیکھا کہ وہ افقی پر سر تا سر پھیل گیا ہے اور اس کی جگہا ہٹ سے ماہ
والیم کی تابانی مانند پڑ گئی ہے خوف، میرت اور ایمانی مسرت
کے ساتھ اس نے اشتیاق بھرے ہلے میں خود کھائی کی، ”یہاں بھی
میں اور وہاں بھی میں؟“

افقی پر سر تا سر پھیل جگہا ہٹ میں مسکراہٹ کا نور چمکا۔

”اگر ہر طرف میں ہی میں ہوں تو پھر میں ہوں کیا؟“

”تم اس سے کمتر ہو جو نظر آتے ہو لیکن اس سے زیادہ
ہو جو نظر نہیں آتے۔ تم نہ مفل ہو نہ پدید لیکن یہ دونوں ہمارے ایک
ہر کے پتے ہیں۔ تم لا حاصل بھی ہو اور کائنات کی قضا کا حاصل بھی تم
بے ثبات بھی ہو اور ارحمن و رحیم کے لئے وجہ ثبات بھی۔ یہی تو ہو
جو اس بے کرائی میں سراٹھا کر چل سکتے ہو....“

رفتہ رفتہ اس کا ہیولا سمٹ گیا اور اس کی جگہ ٹھٹھکتے ستاروں
نے لے لی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں دھندلا جلا تھا اور نام میں کی ٹپک
تک ماحول کی خواب گوئی کو تار کئے دے رہی تھی۔

اس دن وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھا۔ میں سب کچھ
بدل ڈالوں گا۔ اب کوئی آنکھ نہ ہوگی نہ کوئی لب مرف نفاں۔ اب کی دل
میں درد کی ہر بن ڈالیں گی.... میں سب کچھ بدل ڈالوں گا....

وہ گھر سے نکلا تو سب کچھ وہاں ہی تھا۔ وہی ہجوم انداز گار، بھرے
ہرے بازار، کھانوں سے اٹی سرگرمی، کارخانوں پر بھیک خانگی و شیرہ
کوڑے کی ڈھیریں رزق ڈھونڈنے والا نوجوان، انیس دھونڈنے والا
ہیر مرد، ریسٹورنٹ، دکن پڈ بوٹ، پائش والا چھوٹا، سب کچھ جیسے کبھی
تھا۔ لیکن آج تو وہ ایک نئے عزم کے ساتھ نکلا تھا اس نے کوئی کچھ کا
لگا نہ سامنے اٹھ چل پڑی.... کیونکہ وہ ایک اپنے ارد گرد پھیلے
دور رخ کو بہت نہانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی مٹی کو سناٹا

معراجِ رعنا



نسلی خلیج

اُس طرف نہ درخشاں اِس طرف دشتِ سیاہ
درمیاں دونوں کے اک کوہِ عظیم
اُس طرف صحنِ جن
صحنِ جن کی نرم بھینگ گھاس پر
شبنمی ملبوس ہیں دیکے بدن
آرزوؤں کے دھندلے میں
چراغوں کی ٹوٹوں کا تھر تھرا ڈوٹا بھرے اُبھرتا
ہر گلی ہر بوڑھے سر گوشیاں
مستیاں کی ستیاں
دستیوں انگلی سے لپٹیں
بند دروازوں کی جانب گامزن
اِس طرف تیرہ شبی
تیرہ شبی کے دامنِ بڑھار میں
بوڑھی آوازوں کا لشکر خیمہ زن
زرد چہرے پر
ہر اُس رخوت کی تیرہ شبی لکیر
خواب سے ماری ہر اک چشم جنوں
خاتقاہ دل سے ارماں مخرف
دور تک حدِ نظر
اُڑتی ہوئی اک شاہرہ
شاہرہ پہ سو کھے پتوں کا ہجوم۔

● چمکھنڈی۔ سہرام (دہراد) ۸۲۱۱۱۵

● الامین کالج، کولار ۵۶۳۱۰۱ (کننگ)

● ۱۷۹۔ ملاح تلائی، ادے پور (راجستھان)



انور مینائی

انتشار

موجود و معروض کا
اک اک مرکز اب
وقت کی سنگین زد میں
آکر
یوں بکھرا ہے
جیسے دوشیں ہوا پہ
ٹھوس۔

خواہش
سایہ بن کر
لامرکز کی سرحد میں
رقص کتنا ہے اب
رسمیں سب بخود ہیں
اور شکوک نظر آتی ہیں مجھ کو۔
جانوں جانب
تمتیں ہی سمتیں ہیں
جن کی کوئی منزل ہے
اور نہ حدِ فاصل۔!



شاہد عزیز

سیاہ سورج

ادکچہ دیر میں، دن نیکل آئے گا
پھر نہ اندھی گلی
زرد سایوں سے بھر جائے گی
اد میں!
کا درختوں میں تبدیل ہو جاؤں گا
منٹلوں میں بکھر جاؤں گا
ہزاروں طرح کی
صدائوں میں کھو جاؤں گا۔

پھر یہ سورج کی کرنوں میں
لڑتے ہوئے رنگ
مرجائی گئے۔



رفتہ اختر

کالی لین - ٹولک - ۳۰۰۱ (راجستان)

ادب پر تنقیدی مبالغہ

تنقید ادب کا ایک ایسا بادِ پیل ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے موسموں کی نشان دہی کرتا ہے۔ بشرطیکہ دیکھنے والے کی نظر صرف اس مبکرم سے واقف ہو سکے کہ اسے کیا پارے کے آثار چھڑاؤ کا بھی ساتھ دے سکے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم میر کے نکات الشعراء اور حالی کے مقدمہ شعوشاعری کو تنقیدی ابتداء و انتہا تصور کرتے تھے اور ادب برائے فن اور ادب برائے زندگی۔ جیسے ادبی نظریات کو بھولی میں بھاگنے ادب کی نمائش کرتے رہتے تھے۔ پھر ایک دور ایسا آیا جب مقصدی ادب کے پھول دامن ادب پر سجائے جانے لگے لیکن معلقہ ادب بابِ ذوق نے ان پھولوں کی خوشبو کو کاغذی پھولوں کی خوشبو سے تعبیر کیا پناہ ادب میں ہیئت و مواد کی بحث چھڑ گئی۔ اس بحث کا ادب کو ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ ہیئت کے نئے نئے تجربے ہونے لگے ترقی پسند تحریک نے عربی کی گردن دبانا چاہی لیکن جدیدیت نے گڑبھڑنے والی رچی کوڈھیلا کر دیا تو جدیدیوں کو محبوب کر گیا۔ نتیجہ وہی ڈھک کے تین بات! ۱۹۹۱ء کے بعد ادب میں نئے رجحانات نے راہ پائی لیکن صرف فیشن کی حد تک۔ شہک اس طرح جیسے علم اندہ مٹری کے کامیڈین محمود نے کسی فلم میں انگریزی کوٹ کوٹ کر لٹاپن کر فیشن کا مذاق اڑایا تھا۔ انسانی تہذیب و تمدن کا آغاز برہمنی کو ختم کرنے کے لئے ہوا لیکن ارتقار کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہم جس نقطے سے سفر شروع کرتے ہیں گہوم پھر کراسی نقطے پر آجاتے ہیں اس منکوی سفر کے دوران کہیں ہم مسندِ بیت سے دوچار ہوتے ہیں تو کہیں ڈارون کی تھیوری کو ترجمان بناتے ہیں، اور کہیں وجودیت، عدم مرکزیت، لامحدیت، مادہ نریم، بیونریم، فیوچرزم کو قصہ پارینہ سمجھ کر ادب کے ہر رجحان کے ساتھ لفظ پوسٹ یا ما بعد کا سابقہ لگا کر پوسٹ ماڈرنزم، پوسٹ کولونریم، پوسٹ مارکسزم، پوسٹ فرائنڈزم، عرض سب کو پوسٹ کر چکے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا تمام ادبی لوگ بے ادب ہو گئے ہیں۔ ہر محکمہ فکر سے اس سوال کے جواب بعد امداد ملے ہیں۔ مذہب پسند ہیں، دنیا و کائنات کو اپنے طور پر تفہیم کرتے ہیں وہ مادیت پسندی کے غلو کے خلاف ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو مذہب میں روحانی اسودگی کی تلاش میں ہیں اور اچھا یہ رعنش جیسے لوگوں کو ذرا بوجھتا ہے۔ ایک طبقہ کلیئر کی پری کو مقصد حیثیات سمجھ رہا ہے تو دوسری جانب دیہاتی زندگی گزارنے والے افراد شہری زندگی میں سرگرداں افراد کا قصہ اڑاتے ہیں۔ پناہ چار دو فکشن میں دیہی اور شہری زندگی کی کشمکش بیان کرنا تخلیق کاروں کا ایک خاص رویہ بنتا گیا۔ آج وہ تخلیق کار جو سات آٹھ زبانوں کے ادبی موسموں کو دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں، مشرقیت کے دلدادہ ہیں اور آج بھی مغرب سے خدا و اسطے کا پر رکھے ہیں۔ ان کی نظری عرفی فارسی ادب کی بازگشت اور ادب میں سنائی دینا ضروری ہے۔ ادھر مشرق کے بعد کی نسل عربی تو درکنار اردو سے بھی نا اہل ہوتی جا رہا ہے اور ہم ہیں کہ ان سے یہ امید کرتے ہیں کہ انہیں حافظہ، سعدی، رومی، جاحظ اور صائب کے اشعار اذہر ہوں۔ اگر نوجوان زمین کے بجائے لفظ و حرفی استعمال کریں تو ہمارے بزرگوں کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ جاتے ہیں۔

ادب کی ایک صفت وہ بھی ہے جو آفاقی تجربات کو خوش آمدید کہتی ہے اور اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ کی پوند کا اسی سے اردو کو بین الاقوامی زبان بنانے کے خواب بن رہی ہے۔ ادھر معاشرے کی صورت حال یہ ہے کہ سادت، اخوان، دلکشی، زبان بھر لودر حل کرنے والے افراد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نئی نسل میں بڑھتی ہوئی منشیات پسندی نے قدروں کو تہتر زلی کر دیا ہے۔ میلہ یا کی رقابتی ٹولنے کی وی کے اسکرین کو ہمہ وقت لڑکھن دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے اور بے ترقیب معاشرت متحرک منظروں کے قدر کو پناہ تہہ ہنوں کے حواس میں تہری سے رچ بس رہی ہیں۔ ایک ایسا کلمہ

شمیم احمد نے اپنی تصنیف ۲+۲=۵ میں "تنقید کھڑاؤں" کے عنوان سے بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں۔ ان کی نظر میں "تنقید وہ واحد صنف ادب ہے جس کا شمار نہ میٹوں میں کیا جاتا ہے نہ مشینوں میں اور نہ سماجی علوم میں، مگر انفرادہ اس سے نکلتے کہ میوں صمدی میں اسے اردو ادب کی ایک اہم صنف قرار دے کر معائنہ کر لیا گیا تھا۔" سنہ ۱۹۳۷ء تک آتے آتے اسے بیشتر تخلیقی اصناف پر ترجیح دی جانے لگی اور پھر اس کے بعد جی کے جہاگوں چھینکا ٹوٹا نقد ایک ڈکشنری بن گیا۔ جس کو چاہتا تھے دیتا، سرچشمت اور مزاج بخشنا، جس کی میاں کھوں کے سہارے کوئی سکڑا لڑکھو اوقات بن کر چلتا اور کوئی سرخ چھول بن کر ہمت بن کر کھال اعتقاد بھتا وہ اپنا سارا شہر و ادب "اس دختر بے معنی غرق سے ناب ادنیٰ" کہہ کر کسی نادر شاہ کے انتظار میں بیٹھ جاتا، آخر آخر وہ زمانہ آئی گیا جب ایک ڈکٹیٹر نے ایک ادبی نشست میں اپنے ہی ہم مغرب نقاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نشست کے عوام سے اپیل کی "من بند نہیں کر دیتے آپ اس جابل کا"۔ افسوس کہ اس کے فوراً بعد اس تحریک ہی کا منہ بند کر دیا گیا، مگر نہ ان ادبی آدموں کا نظریاتی دور کہیں یہاں تک آگیا ہوتا تو جگر جگر پچ پچ کی سولیاں نصب ہوتیں اور ان کے مخالفین ادب کی قربان گاہ پر نہیں بلکہ ان پچ پچ کی سولیوں پر لٹے نظر آتے اور ان پر نصب تختیوں پر لکھا ہوتا کہ یہ لکھنے والا عوام دشمنی اور رجعت پسند عناصر کے ہاتھوں کھیل رہا تھا۔ آخر وہ زمانہ نہ اسکا مگر اردو ادب تنقید کے ہاتھوں واقعی سولی پر چڑھ گیا۔ مجھے اپنے ادب میں تنقید کا وجود "بھرت" کے مائل نظر آتا ہے جس نے تخت پر رام کی کھڑاؤں رکھ کر سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ بھرت اپنے اس فعل میں مخلص تھا اور ہماری تنقید تخلیق کی کھڑاؤں کو بمشکل برداشت کر رہی ہے (مگر مجھ کو یہ ہے کہ تخلیقی کھڑاؤں کے بغیر اس کا اپنا وجود بھی نظر سے میں ہٹ جاتا ہے) اس جگہ سے تنقید کا وجود خفا اور معنوی تصور چھوٹتا ہے اور اس کے سیاسی اغراض و مقاصد کا ثبوت ملنے لگتا ہے مجھے خود بھی تنقید سے دلچسپی رہی ہے اس لئے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ میں تنقید کی اہمیت سے منکر نہیں مگر میری مشکل یہ ہے کہ میں ایک تو گنگوٹلی کو راہ جو جرح نہیں کھڑاؤں اور دوسرے اصل معمرال امام ہی کو بھٹتا ہوں اس کی کھڑاؤں کو نہیں۔

شمیم احمد کا یہ جملہ کہ "گنگوٹلی کو راہ جو جرح نہیں کہا جاسکتا" تنقید کے ضمن میں ہمارے ناقدین کو دعوت نکال رہا ہے۔ کسی بھی نثری تحریر پر صنف تنقید کا ایسا لگانا درست نہیں۔ وید، زبور، انجیل، قرآن مجید پر کسی صنف کا اطلاق کیا جاسکتا ہے؟ مکالمات افلاطون، مہا بھارت، روم کے احکامات پر سہل کی جنگ عظیم، ہینری ڈانشور ورن کے اقوال (جو یقیناً عظیم تحریریں ہیں) کیا انہیں کسی صنف سے منسوب کیا جاسکتا ہے؟ یہ خطوط غالب، آب حیات، میرۃ البی کو کس خانے میں رکھیں گے؟ یہ ظاہر ہے جواب گول گول ہوگا۔ لیکن یہ بات پورے ذوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان تحریروں میں تخلیقی جوہر موجود ہے جو عالمگیر ایبل رکھتا ہے۔ انہیں پڑھ کر انسان خود ایک گلی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کیا آج کے ادب میں ایسی روح پرورد کیفیات اور آفاقی جہات موجود ہیں۔ اگر نہیں تو کوشش کی جلتے کہ ہم ادب کے ایسے نئے جہات قائم کریں جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو جو نو شامدانہ یا ماحاندانہ نہ ہو جس میں طبع نہ ہو، صداقت ہی صداقت ہو، قصیدہ خوانی نہ ہو، گدھے گھوڑے ایک نہ ہوں، سنجیدی ہو، متانت ہو، اسلوب کی سادگی سے ادب کے دامن کو سہا یا جائے۔ بھلا ہو بھائی اختیاء امام کا جنہوں نے "غزل پر مینا تنقیدی مکالمہ" کے ذریعے شہری اخفی کی بھڑکی ہے غزل ہی اردو کی وہ واحد صنف تھی جس کے ایسے شعر کسی بھی تہائی کو محفل بنا سکتے ہیں پورے وجود کو تازگی دے سکتے ہیں یہ تاثر کسی اردو صنف شاعری میں نہیں۔ ترقی پسند تحریک کی تمام تر کوششوں کے باوجود صنف غزل آج بھی زندہ اور درواں دواں ہے۔ آج مغرب کا مہذب طبقہ یہ غور کر رہا ہے کہ دس ہزار صفحات کو اگر لفظ B (بی) سے ظاہر کر دیا جائے تو نہ صرف رو پر بلکہ وقت کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے غزل کا ایک تہذیبی وصف یہ بھی ہے کہ یہ عربی، عجمی، اور ہندی تہذیب کے مشترک عناصر کی مظہر ہے اگر اس کا سلسلہ نصب تلاش کیا جائے تو قدیم ادب کے سرمائے میں یہ تو زائیدہ اسلوب کے طور پر ابھر کر آئی۔ ظاہر ہے کہ قدیم فارسی بہ سہولت، زبرد، سنسکرت اور پراکرتوں کے ادب میں اس کے نقوش نہیں ملتے۔ اس لئے یہ کہنے میں کوئی تاثر نہ ہو چاہا ہے کہ غزل ہی ایسی صنف سخن ہے جو جدید اسلوب و جدید غزل "کے نام سے معارف ہوئی اس لئے ادب کے نئے جہات کے تخلیقی اظہار کے لئے غزل ہی ایک موثر ترین صنف ہے۔"

آج کے عہد کو دانشور، سائنسی عہدہ کہتے ہیں ان کے خیال میں جراثیم، ادب میں نہیں سائنس میں سرگرداں ہے اور سائنس ہفت افلاک میں اپنی فتوحات کا ڈنکا بیٹ رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج کا انسان کیا سائنس کی گرم بازواری اور مشینوں کی بے حس دلیلے خوش ہے۔ میرے خیال میں آج کا تخلیق کار ایچی وجود میں مچوں کھربوں لوگوں کی موت کا خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ [ہالی صفر ۱۴۰۱ء پر دیکھئے]

میں جب بھی قریب دیکھتا ہوں تو خود کو زیادہ جوان محسوس کرنے لگتی ہوں۔ تم بے خوف ہو جاؤ، میں تم اپنے پرکاشے میں چھپتا ہوں۔ لیکن یہ ہی سب کچھ تمہارے لئے خطرہ بھی ہے۔ -

اس کہانہ کے خالق کو اس سہ ماہی کے ترجمہ میں سال خاموشی کی سزا جگمگتی بڑی۔ ونگ میگزین چلے لیغا (۱۹۷۶-۱۹۸۰) اور رانی وینگ شو (۱۹۵۰-۱۹۸۵) کے پت پر پورٹلانی ادب کے خاص میں شامل تھے۔ انہیں شعری ادب میں علامتی تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چین کے ادبی سرکاری پبلیکیشن اور لاسکی حصہ بن کر لیا کا تحریک اور موجودہ صدی کی دور رس کامیابیوں میں سے ہی شروع ہو سکتا تھا۔ لیکن ۱۹۶۹ کے بعد اس کے نقوش واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ جیادو مارکس کی رہنمائی میں چین کی کمیونسٹ حکومت کے آغاز تک ہے۔ چین میں تائی وان اور یینگ کے شعراء نگار انہماک مسلح برادریوں میں منقسم محسوس ہوتے ہیں۔ ایک طرف بیرونی اثرات کے خلاف شاعری میں دلیبی جذبہ و احساس بر اصرار اور انہماک و بیان کی جدت سے انکار ملتا ہے۔ دوسری طرف یینگ کے شعراء جدیدیت کے فخر مندوں کی نمائندگی سے آبداری میں مصروف ہیں۔ چین کے ادب کا موجودہ پس منظر انہیں متضاد رد و قبول کا آئینہ ہے۔ یہ متضاد رویے تنقید میں پابند و آزادانہ نظم، روایت اور جدیدیت، مقلد شاعری اور نیا لہجہ شاعری کے بحث و جدل سے ظاہر ہوتے ہیں۔ چین کی شاعریات کی تخلیقات کم و بیش اسی منظر نامے کا حصہ ہے لیکن اس فرق کے ساتھ جس کی طرف انہیں خود انٹر نے اے ایک ٹولن میں اشارہ کیا ہے۔

”موجودہ نیا ایک ہی دہائی میں بہتے ہوئے، مردوں کے مختلف دہائی کی شہری ہوتی ہیں۔ ان کا ادب بھی اسی لحاظ سے آگ بھان رکھتا ہے۔“

ان شاعروں کے موضوعات اور ان کے برتاؤ میں اس فرق کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جنگ تھک پیدا کنش ۱۹۵۵ء سے نئی شاعریوں تک (۱۹۹۵ء) تک نوازین کی نثر شاعری نے تقریباً پانچ سو موضوعات سے زیادہ کا سفر طے کیا ہے یہ شاعری جو موضوعی زنجار تھی اور ناخوار و اظہار کی جھانجی ہے، اس میں چین کی عورت کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔

① بنگ شنگ پیدائش ۱۹۵۵ء میں بنگ شنگ شاعرہ ہیں۔ شنگ نے چین میں تعلیم مکمل کی ہے، امریکا میں ویسلی کالج میں ماسٹر ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ وہ شاعری کے علاوہ ادبی و تحقیقی ادب کا بھی اہم نام ہے، خلی جیون اور میو کی مترجم بھی ہیں۔

(۲) گھنٹہ گنگ سنگ (۱۹۹۰-۱۹۱۶) جبر کی کئی ادب تحریک کے انہوں نے نظریاتی و ادبی کے ساتھ موضوع و اظہار میں قمرانی زبان کی تامل میں۔ جبر کی تامل کی نام کے ادب میگزین کی مدیرہ بھی ہیں۔ ۱۹۹۹ میں آزاد کی سید حیات سے منسلک ہو گئیں۔ تین شاعری مجموعے اور کئی نثری کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

(۳) نوٹیشن: جن پیدائش ۱۹۴۶ء میں کی گئی تھیں وہ ان کے پیدائشی نام پر ۱۹۸۱ء میں، قومی شاعری اعزاز، حاصل کیا ہے۔ ان کی نقالی، خوبصورت زبان اور طرزِ زبان کی عظمت کے کافی مقبول ہیں۔

۴) ہنگ پڑ پڑائش ۱۹۴۸ء شکار۔ شکار میں یوٹریش میں غنیمت مکمل کر کے، اس میں نیکیا رنگ حقیقت سے کام کر رہا ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ مشاعر کی قیمت ۱۹۸۶ء شکار میں ہر کتاب ہے

۵) ایک تباہ کن پیدائش ۱۹۵۵ء میں یونیورسٹی کے سربراہ پرنسپل کے بھائی کے ایک غم آسٹوڈیو میں کام کیا، آج کل شین زمین میں ہیں۔ سیاری ادب رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

۵) شوہنکے بعد انتقال 1952ء۔ چمن کی مقبول ترین شاعرہ ہیں۔ ان کی ایک نظم ”میرا وطن میرا پیارا وطن“ میں کھجور کی اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ کافی مشہور ہے، ایک بار شری گجرات کے شاعر ہرچکے ہیں انہوں نے اپنی شاعری کی بارے میں لکھا ہے کہ۔ میری نظمیں غم و خوشی کا خزانہ ہیں۔ یہ صوفی و وطن کی محبت کا پیارا زمین ہیں۔ انسان و شوق کی تہذیب کا قصیدہ بھی ہے



محمد محمود احمد قاضی
ملٹ کالونی نمبر ۲، راہ دہلی، گلبرج، دہلی۔ پاکستان

نمبر ۱۰۰ عداد المریعہ دروازہ

اس گھر سے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔
اس واقعہ سے چند دن پہلے امارہ کی بیوی ایک مہینے کے لئے
ایک مغربی گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس پہنچی گئی تھی۔ وہ کہلا
تھا۔ امداد اپنی زندگی کی تنہائیوں کی خوشی میں ڈوب رہا تھا۔ یہ کہیں کہیں
اس کے مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے میں ایک مہینے تک اس سے
دور رہا۔ پر ایک شام کو کھانے کے وقت سے دوا پہلے دہانے پر تھی
ایک بیگ پر کپڑے ہوتے ہوئے ہوتے ہوئے انداز میں گھر سے ملے آیا۔
تین دن پہلے ملائے۔ بات بہت عجیب محسوس ہو گئی۔ اس نے
ایک فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ جیٹن ٹیویس وی فیوٹر سنٹر کی کھانا ادا کر رہا تھا
اور اس خیال سے کہ اس طرح اسے بہت سے لوگوں سے سامنا کرنا
ہو گا۔ وہ اس شام گھر سے باہر نکلے ہوئے بیگیاٹ محسوس کر رہا تھا۔
تفریح کی خواہش، کھر حال پہلی بار اس پر عادی ہو گئی۔
اس نے جلدی جلدی نہانے کے بدلے اپنے اتار کا بنایا ہوا آئینٹ
تیسری سے ٹھکرا اور پھر لباس بدلنے کے بعد اس نے شو شروع ہونے
کے مرتبہ چند منٹ پیشتر اپنے آپ کو سینا بال میں پایا اس شام کی بھی
بہت سے فلم میزوں کے درمیان موجود تھا۔ اور یہ اس نے فلم دیکھنے
کے بعد جانا۔ ہر کوئی اپنے پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا
اور دوسرے میں امارہ کو جانوڑے رہا تھا۔ وہ قطعاً خوش دکھائی
نہیں دے رہا تھا۔ کی بار ایسا محسوس ہو کہ وہ ابھی سینا بال سے اٹھ
جائے گا۔ ادا کا بدلے کے لئے سے تیار ہو کر وہ فلم کے اختتام تک
بیٹھا رہا۔ اور رات گئے گھر لوٹا۔
وہ میر دلی اعلیٰ کا دروازہ کھول کر کھنکھن میں داخل ہو تو ان بڑا
کڑکشی میں نہائی۔ جن کو وہ جھٹکا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر کے دروازے
پر پہنچا تو وہاں بھی کڑکشی تھی۔ لیکن جس جیسے نے اس کے پاؤں کو لٹکائے

سولہ سولہ آنکھوں والا چہرے نہ کہ گھر اس زوجہ کے ذمے ہی کی
قدر تھا۔ کھانے کے بعد اس نے امداد کے پیٹ میں سارے زندگی میں کوئی
پہلی نہ تھی اور جس کے گھر خوش انداز تھے۔ گھر سے پڑے تھے۔ میرے خیال میں دنیا
کا سب سے پرسکون شخص تھا۔ اس نے سکون خاطر کی اور تنہائی سے اپنا تاد
جوڑ رکھا تھا۔ اس نے یہ دیکھ اپنی مسل ہٹ دھرمی سے اختیار کیا تھا۔
وہ جرم کے شدید شریک سے گھر آتا تھا۔ تنہائی میں اس کی ساتھی تھی۔
خدا نے اس کی خواہشات پوری کر دی تھیں۔ پچھلے دس سالوں سے
ایک تھائی لٹل سے میں ہوا کا ڈنٹ کام کرتے ہوئے اس کی مالی زندگی
خاصی بہتر ہو گئی۔ اس نے اس دوران شادی کی ایک ایسا گھر میں اس
نے بنایا جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ مگر جو دروازہ بچائی پر ہلکا گیا تھا۔ اور جس کا
بھلا بھی ایک خافقی تاد میں بیٹا ہوا تھا۔ عام گھروں سے کافی ہٹ کر بنایا
گیا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ دشمن کی طرف سے تاجر پرکشش
درختوں کی گھنے بن کے درمیان سے ہو کر جاتا تھا۔ اور دوسرا شمال کی گھٹ
رے تاجر پہلے راستے کو کٹا ہو کر تری بانے میں گم ہو جاتا تھا۔
مکان کی پچھلے طرف سے دھلے کا راستہ شمالی راستے کی جانب جاتا
تھا۔ وہ ہر شاخ کو کام سے خارج ہونے کے بعد ملکیت بھراؤٹھ کے لان
میں کام کر کے زیر دماز ہو کر اپنے اقولوں تک بکڑے مطالعے سے
لطف اندوز ہو کر ناپسند کرتا تھا۔
میں ہر دوسرے دن اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ مجھے امداد اپنی بیوی کو
ایک ادا کر کے لے لیتا۔ اور پھر کسی غیر فریب پانچنے کے بعد میں آگے
قریب بیٹھ جاتا۔ اور پھر سورج غروب ہونے تک ہم دونوں نیچے خاطر شی
میں ڈوبے رہتے۔
زندگی کی اس یکسانیت اور سکون کو جس میں کبھی بھی درختوں پر
چھپنے والے پر خوف کی آواز نہ آتی تھی۔ کبھی کسی شخص نے ایک دن

تھے۔ وہ یہ بھی کہ دروازہ بالکل کھلا تھا۔

اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ باہر چلتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کر کے گیا تھا۔
— تو میرے دروازہ کس نے کھولا تھا؟ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ شاید یہ میں تھا جو اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن یہ کس طرح ممکن تھا جبکہ ہم دونوں نے مشورہ کرنے کے بعد ایک دوسرے کو اطلاع کیا تھا! اور اگر یہ میں ہی تھا تو میں اندر کیسے داخل ہوا جب کہ میرے پاس اس گھر کی دوسری چابی ہی نہیں تھی کیا یہ کوئی اجنبی ہے لیکن نہیں۔ وہ تو اجنبیوں سے متاثر ہی نہیں تھا یہ یوں ہوا تھا کہ وہ چابی دروازے میں ہی جھول رہی تھا۔
لیکن پھر وہ اپنی بیوی کی ایک عیب کے لئے اس میں چابی کی موجودگی کی طرح محسوس کر سکتا ہے! اگر یہ یہاں نہ ہو تو پھر اسے دروازے کے چابی کے سر پر لٹکی ہوئی چابی کے ہاتھ سے اس بات کا اسے پتا چلتا تھا کہ اس نے دروازہ بند کیا تھا۔ اس سے یقین تھا۔ اسی لمحے اس نے گھسی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا کوئی اندر ہے! لیکن جواب نہ ہوا۔“ اندر کوئی ہے“ وہ دوبارہ بلایا تھا۔ یہی خاموشی! یہ خاموشی ناقابل برداشت حد تک پراسرار طریقے سے اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔

وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے جاگ جانا ہوا۔ مگر پھر اس نے اس اقدام کو بے فوٹی سمجھا۔ وہ پھر آگے بڑھا اور اس نے اس دروازے کی طرف دیکھا۔ جس نے اب اس کے اندر ایک طرف بصر دیا تھا۔ رات اب جیگہ ہلی تھی۔ چارچوڑ تیرے ٹھنڈے تھے مگر اس نے گھر میں داخل ہونے کی ہمت نہ کی۔ وہ سنا نہیں تھا۔ اور اسی لئے وہ حیران ہو کر سوچ رہا تھا کہ وہ کچھ کی صورت میں اپنا بچاؤ کیسے کا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی سنا ہی نہ تھا کہ اس نے گھر میں سوچا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ مرد دروازے پر ایک ہتھ آدھی کتنا غرور کرتا ہے۔ یہ بات جانتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس صرف ایک ہی زندگی ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات آئندہ زندہ رہنے کے لئے دوسرا موجود بھی نہیں ہوتا۔ وہی کھڑے کھڑے اس نے کسی دوسری جگہ چھ مہینے گزارنے کے بارے میں سوچا۔

لیکن اگر یہ بات پھیل جاتی تو اسے بزدل سمجھا جائے گا۔ نہیں جاگ جانے سے مرعبانہ اچھا ہے۔ مگر ارادے کے ساتھ اس نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔ وہ جتنی میں نہاؤ تھیں گے وہی کھلی دروازے کے ہتھل کے کچھ کر اس نے دروازے کو پکڑا کھول دیا۔ اور پھر وہ لادنے کے دیا

گھر پر اسے بڑے کامیاب رہا تھا۔

وہ ایک خیر میں گھرا ہوا تھا۔ کھانے کی میز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کچن کے آخری سرے پر بالکل پورے ساتھ اس پر وہ طہیث ابھی تک دیں پڑی تھی۔ جس میں کس نے آٹھ کھایا تھا اور اس کے قریب چاقو، نوک، ایک خالی گلاس اور ایک ڈش کلا تھیں پڑا تھا اس کی بازوؤں والی چادر سیاہی میں دیں گھر سے بڑی قانین پر پڑی تھیں۔ اور اپنی جگہ سے ہلکی نہ تھیں۔ لیکن ہانگی ٹکڑی سے بنی الماری اسے مزید چھوڑ گیا تھا۔ یہ کھلی پڑی تھی۔ اور وہ جس نے کچن کے برتنوں وغیرہ کے علاوہ یہاں کچھ اور تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اس کے پٹ یوں ہی دیکھا جو وہ دیکھتے تھے۔ یہ کچھ ملن موجود ڈشبلینڈ نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ وہ اس کے قریب آیا اور ایک چھوٹی سی لٹکے کا لٹخ کے پاس ایک گلیا کپڑا پڑا دیکھا۔ یہ چیز یہاں کس نے ڈالیں ہیں! اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور محسوس کیا کہ اس کا اس طرح کو دروازے کا تار توڑنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن یہ کپڑا۔

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ کوئی گھر میں ضرور داخل ہوا تھا لیکن کون! اور اگر وہ اس وقت گھر میں ہی کہیں کی جگہ چھپا ہوا ہو تو وہ اس خالی ہی سے کامیاب کامیاب کیا کہ کوئی اس وقت بھی اسے دیکھ دیا تھا۔ اور اس پر وہ آندہ ہونے کے لئے پرتو رہا تھا۔ اس نے ابھڑے جانے کے بارے میں سوچا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اس کے ہی کی حالت میں کئی کئی لمحے کے لئے پکارتے کے قابل نہیں رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا جو اسٹوروم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس نے لٹکے سے گھول دیا اس نے یہ محسوس کرنے کے لئے کہ کوئی اور تو اندر موجود نہیں پتلا اس قہورے سے کھلے ہوئے دروازے میں اپنا ہاتھ اندر بڑھایا۔ صندوق بیگ۔ اور الماری ساری چیزیں دیں تھیں جہاں وہ انہیں چھوڑ گیا تھا اس نے باقاعدہ اندر پلٹو دم میں جھانکنے کی ضرورت اس نے محسوس کی کہ اس کے نزدیک وہاں کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی۔

وہ آرام کر رہی تھی کہ اس نے اس کے گھر میں نقب فرود لگائی تھی اور اب اس کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی پتلا چور نہیں تھا۔ وہ یہاں سے ہر چیز اٹھا کر لے جاسکتا تھا۔ یہاں کوئی اس کا ہاتھ نہ دے والا نہیں تھا۔ تو پھر۔ کیا وہ اسے جان سے مار دینے کے لئے آیا تھا! ہاں یہاں تاغیبن بھی تو نہیں تھا۔ تو کوئی نظر نہ

میں ایک لادوشت بیت اچھی مال حیثیت کا مالک ہو سکتا تھا کوئی بھی عامل شخص اس کے دود کو ختم کرنے اور اس کا جائیداد کو چھینانے کے لئے ایسا اقدام کر سکتا تھا؟

اس نے اپنے قریب ہی پرستے ٹیلی فون کا ریسرواٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

ہیلو۔ پولیس اسٹیشن؟ میرا نام کے بچے پولیس چیف مشرودک سے طویل ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔

چند لمحوں بعد اسے بتایا گیا کہ پولیس چیف مشرودک سے بات کیجئے! مشرودکسٹر۔ میں امارہ ہیلو رہا ہوں۔ میرا نام کے بچے فوراً میرے گھر پر قشربین لائیں۔ کوئی یہاں میری جان کے دوسرے ہے۔ بڑے کلک کے مطابق اس وقت رات کے دو بجے تھے۔

بالکل منت بعد پولیس چیف اپنے ایک ماتحت کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ اندر کے سامنے بیٹھ گیا اور فوراً کسی انکوائری شروع ہو گئی۔ دھکے اٹھاتے ہی تک ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ مجبوراً چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کہ اندر کے کسی ہسٹنگس کے بغیر یہاں اتنا دودریہ مکان کیوں بڑایا اس کے پاس کتنی چابیاں ہیں؟ اس کی بددیہان گئی ہے۔ اندر کتنے عرصے کے لئے گئی ہے؟ کیا اس کے پاس کوئی ڈاکو بھی ہے؟ کوئی محافظ؟ کون کون سی چیزیں چرائی گئی تھیں؟ کیا اس نے باغ میں قدموں کے کوئی نشان دیکھے ہیں۔ اسے ختم کئے کون فائر اٹھا سکتا تھا۔ دوسرے سوالات اس سے پوچھے گئے۔ لیکن کی کوئی کیا قیدی میں آپ پر چڑھتا ہوں۔ جبکہ جوابات اس سے بالکل مختلف نہیں جو آپ پہلے سے جانتے ہیں۔ دو کنبے سب کو ٹوٹ کر دیا اور یہ راز کی بات ہو گئی۔ اگر کہیں آپ کو یہ بتا دوں کہ وہ کنبے امارہ سے متعلق تھا کہ مسلح کو دھمکی دے واڑہ کھولنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اور کپڑے کو اپنی انگلیوں کے نشانات ملنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اور وہ پراسرار شخص جو یہاں مکان میں داخل ہوا تھا اس کی نیت یہاں سے

کچھ چلنے کی نہیں بلکہ کچھ اندر۔

اب جو کچھ اندر ہو رہی تھی اس کے ان پیکر وہاں سے چلا آیا۔ مگر پولیس میں کوئلہ کے پاس میں مجبوراً اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا؟ ہو سکتا تھا وہ "شریف آدمی" پھر چلا آتا ہے۔

اگر دن اندر اچھی پولیس میں وہاں اس لئے موجود رہا تھا کہ اس طرح وہ اس عقب دسے برابر ڈال کے تو اندر سے ہی اس حالت میں یہ وقت گزارا جیسے کہ اس کی زندگی کے دن ختم ہوئے ہوں۔ دن اور رات کے تعلق حصوں میں خندینے ہوئے اندر نے خوابوں میں ایک بے حد کے آدمی کو اپنے سر پر ایک ٹکڑا تانے ہوئے پایادہ اپنے اس ڈراؤنے خواب کے دہرائے ہمیشہ اس وقت ڈر کر جاگ گیا تھا جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ خون ناک ہتھیار اس کی گردن پر کرنے ہی والا ہے۔

نیرسری صبح تک جب کوئی انہونی بات ظہور نہ پذیر نہ ہوئی تو پولیس چیف نے اپنے آدمی کو دابیس بلا لیا۔ اور امارہ ہر اکیلا رہ گیا۔ پھر کے بعد دابیس پر امارہ اپنے گھر کے باغ میں بڑی دیر تک ٹھہرا ہوا اس کے چہرے پر برائی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ باڈیچہ ہکا بکھڑا پیش کے دفتر کے اس بھڑکی حشر دیکھتا تو ایک حقیقی جنگل کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ جھنڈ۔ ہاں دانتی۔ اس نے اس کے بارے میں پہلے کیوں

نہیں سوجا؟ وہ ادھر ہی سے آیا ہو گا۔ وہ یقیناً ان جوتوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس جھنڈ میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اور اس رات اس سے ملنے آیا ہو گا۔ وہ کنبے گیا جوتوں کی بنی کے درمیان میں رہنے کے قصور نے اس کا خون خشک کر دیا تھا۔

وہ ایک عرصہ ہوا۔ باڈیچہ ہٹا۔ اور پھر گریس داخل ہو گیا ایک لمبے بعد وہ اپنے آپ میں ایک بیگ بکھڑے ہوئے نیرسری قدموں سے چلتا ہوا باہر آیا۔ اور شہر کی طرف چل پڑا۔ چل کی مینار کے اوپر سے کوئی موڈن دن کی چوٹی مینی مینار کے لڑان دے رہا تھا۔ اور اس طرح اندر نے جب اپنی تنہائی کو خیر یاد کیا تو اسی لمحے اس کے تمام خوف اور خورات بھی ہلچل مچا

بقیہ صفحہ ۸ فراتز کافکا کا جہان

علت جو مرد راج ثابت کرتا ہے۔ اندر یہ تکنیکی اشتراک کچھ کم تو بے طلب نہیں۔

نجل ٹوڈ پر ۱۹۰۰ء کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں نے کافکا کو کہیں زیادہ بہتر انداز میں دیکھا اور پرکھا ہے جس کی سب سے بڑی وجہ کافکا کے جملہ کام کا عمومی تاثر یعنی مجبوری کا گہرا احساس ہے۔ انسانی پیش بندیاں نفرت کے کام میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکیں۔ کافکا کا انسان قہر و نفرت سے بے پروا ڈھلے۔ اندر مزاحم ہونے کی سکت نہیں رکھتا۔ تاہم بڑی دلی سے محروم، تنہا اور ناتواں فراتز کافکا کا

جہان۔ ❀



افتخار امام صدیقی

مال: دنیا اور کائنات

میں نے
دنیا کو
اپنی مال کی دعاؤں سے باندھ دیا ہے
اب کائنات کا حصول
میرے لیے آسان ہو جائے گا

ایک نظم
میرے لاشعور میں
عمر سعد کا
کوئی لمحہ

محفوظ نہیں رہا
سوچت ہوں تو
روشنی کے تیز لہریں
ابھرتے ہیں
گم ہو جاتے ہیں
آواز سانسے
گوخ بنتے ہیں
لوٹ جاتے ہیں
کوئی جذبہ
کوئی احساس
باقی نہیں رہا
میں!

شاید اپنے لئے مرجھا ہوں۔

نام نہاد قلم کاروں سے خطاب

کچھ ہی تخلیق کار
خاموشی کے مراقبوں کو طویل کرتے ہیں، اللہ
اپنے حرفوں، لفظوں کے جہاں آباد میں اترتے ہیں
سخن خواب کی تعبیر کے
پیش آمد کو صبر بناتے ہیں
ریاضتوں کے عذاب کو
لمحہ لمحہ کشید کرتے ہیں
فن پارے کی تخلیق کے بعد
لے اعتکاف میں رکھ دیتے ہیں
اور اپنے نفس کے

خس و خاشاک کو صاف کرتے ہیں
اس طرح اپنی تحریریں
اپنا تخلیقی قلم بھارتے ہیں۔
لیکن

بے شمار قلم کار
اپنی شخصیت سے باہر
سماجی نام آجھار سے
فن پارہ تکاٹتے ہیں

اور
کسی زندگی سے پہلے ہی
مر جاتے ہیں۔

ایک نئی دعا

دکھ دے
میری یادداشت میں
وہ سب کچھ
جو تو نے
کمی کو بھی عطا نہیں کیا
اور وہ بھی
جو ترے پاس نہیں
مگر!
خالق ہے تو۔

روح کی سجاوٹ کا
تجسس تمام تر
روح محفوظ سے ماوراء

☆ ایضاً فراموش نہ کیجئے کہ —————

ہاں اصلی میں تو مخاطب کے سر پر "حرمت" لکھا
 ہے جسے دیکھ کر، سلطانِ اَدب نے "کہہ" بکھر نکلیا
 جیوں اور "خلفِ اللہ قدم علی سورت" کی عمدہ
 تفسیر پیش کر دی۔ حوازمِ اللہ خیر العجزہ۔ اذنی
 قہ کے گمراہ ہوا تھا کہ اے۔۔۔ قلمِ ہند

☆ سید احمد — شہید (اہل تشیعہ)
 جس سے ہمیں کاغذ ملے، حق کوئی اور ہے۔
 یہ مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ہے۔

☆ درویشِ آخر — قلمبرفہ جامعہ (دہلی)
 "قلمبر" "مکتبہ سہ ماہی" میں "مکتوبات" کے تحت
 اس قلمبر قادی نے فنکارانہ تخلیق کی غزل۔

۱۰ اکبر محمدی — منشی اسٹریٹ، لاہور، ۱۹۷۱ء
 آپ کا یہ بہت قابل اثر ہے۔ "ظفر" کو سب
 نظریات کا مشرق اور مرکز ہے۔ ایک ایسا قدم اٹھایا
 ہے۔ اپنی سالانہ کی مثالوں پر بھیجے۔ وہ تو اپنے اپنے
 ذہن سے اور اپنے اپنے سرے پر نہیں لکھتا۔ بلکہ اصل
 قلم کار کا تمام نظریات کے بعد دیکھ کر اسے دست برد چلے
 ہیں۔ یا صاحب! ایک ایک کر کے غلامی کے بارے میں
 منشی سراج احمد کوئی نیا فن نہیں ہے۔ ایک نئے فن کی

سالی عدوتی بنام بلراج کد

تم نے سچی خدمت گزارا۔ (سات آدمی پہلے کی قوم
 ہے) آخر تم سچی خدمت گار ہو یہ بات سچی کہہ رہا ہے اس
 میں تو نہیں شاید یہ کہ تم میں اور ذات کو اب نہیں سمجھتے
 (یہ بات تمہاری روش میں جیسا کہ وہ مان رہا ہے کہ اس کو خدا کے
 تمام انکار تمام نہیں ۹۹ حصہ ظاہر وہاں اور اس کو ظہری
 ایک جنس سے منسوب کر رہے ہو)۔ تم نے مجھے "ہمارے
 ظاہر" ظاہر" کے نام میں تمہارا ذکر نہیں کر سکا
 "ہمارے ظاہر" نے ۲۰۲ میں میں تقریباً ۳۰ (تین سو)
 صفحات تر کے سچی گفتیں اور ان ۳۳ صفحات میں اس لئے
 جس اور ذات اور سچی میں اور تر سچی کسی اور ترج کے س
 سے ڈرے جگہ اور میرے دوست مشائخ احمد علی شہی لے
 اے (ان ۲ صفحات کو) کر دینے کے بعد مجھے فوان کیا اور کہا
 "خانی میرے ہندو مجھے لے اور مجھے یہ دو صفحہ بد"۔ تر
 اور ظہری کی حمایت اور آپس کو سمجھنے کھلے کئے یہ تر
 "ظاہر" "میلہ" "تر" "اور دوسرے آدمی اور۔

وہ اسکی طرف ہاتھ کئے، ایک میں مچکا
 اور تین دھوری تھی۔

”عورت کو مرد کی پشت پر رکھنا ہوتا ہے“
 نہیں سلطان محمود جو اس لیے یہ قہر کہے کہ دیا اس نے
 وہ اس کی دل کھلے ہونے سہا۔ یہ غلط فہمی پشت پر رکھنا

1. _____

اعلان

نیم پتی کا سنگھاردان ان برہمن نے لکھا۔

شمسول احمد کا سنگھاردان کس نے لکھا.....؟

میں نے شاہد انور کو ان کی درخواست پر اپنی شہرہ آفاق کہانی ”سنگھاردان“ کو ڈرامے کے قالب میں ڈھلنے کی تحریری اجازت اس شرط پر دی تھی کہ عنوان کے نیچے یہ عبارت تحریر ہوگی کہ ڈرامہ شمسول احمد کی کہانی ”سنگھاردان“ پر مبنی ہے ڈرامہ سنگھاردان اردو اکاڈمی نئی دہلی کے ڈرامہ فیصل میں شامل ہوا۔ لیکن اجازت نامے کی بنیادی شرط کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ ناظرین کو دعوت نامے تقسیم ہونے کے اور ڈرامے پر تجربے مختلف جرائد میں شامل ہوتے۔ اس میں یہ تحریر نہیں ملتی کہ ڈرامہ شمسول احمد کی کہانی پر مبنی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہد انور نے ڈرامے کی کہانی کو اپنی کہانی بتایا ہے۔ اور اکاڈمی سے رائٹس کی بھاری رقم وصول کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو شاہد انور قانونی گرفت میں آجائے ہیں۔

میں شمسول احمد جناب شاہد انور کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ ڈرامے سنگھاردان کو کسی جریدے میں شائع کرے یا آئندہ کسی بھی ادارے سے اس کو ایلیج کرانے کے اجازت نہیں کریں۔ ورنہ ان کے خلاف سخت قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

رابطہ

شمسول احمد، سرگرمیڈ اپارٹمنٹ، نئی پانچویں پٹنہ ۱۱
فون نمبر — ۳۵-۳۴۱-۲۱۱۲-۴۱۲



مشہور شکاری اور محنت ازاد بیٹے شاعر



کا

دلکش مجموعہ کلام

فکرون اور علم و دانش کا حسین مرقع



شرح

قیمت ۱۵۰ روپے
صفحہ ۲۴۲

رابطہ

لالہ زلیا کاظمی، ۱۶- ڈی- ۳ جناح کالونی
مسلم بوڈ، سن آباد، لاہور (پاکستان)

فکر امروز



میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حال ہوں۔ میرا شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا ملکہ ہوں جس کا موضوع صورت و خوراک یا اس کے تعلقات ہوں یا جو امر و بستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام عناصر کا مزج وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکز محبت ہو۔ جس طرح علم، شاعری کے لئے ضروری دماغی ہے۔ اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم و ملزوم سمجھتا ہوں اور خیالات میں تصنع یا بنوط کا حال نہیں۔ میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلک بیان ہے۔ گو مجھے عام اصناف سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعری الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعور میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا موید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غراوت، زہو اور جلیبی تعلیم یافتہ اصحاب پر آسانی کچھ سکیں۔ میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء، غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔

[شعر الحیات، کلیم عبس - ۱۹۳۶ء]

سیلاب اکبر آبادی

جلد ۴۹
شمارہ ۶
فون: ۳۸۲۹۹۰۳
پانی
غلام
یوسف
بروز
پادگار
آغا
نور
۱۹۹۶
سال
۱۹۹۶
۱۹۹۶
۱۹۹۶

مدیر

افتخار امام صدیقی

معارف

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۷ روپے



زیر سالانہ ۷۵ روپے
لاٹریوں سے ۹۰ روپے

نامہ شریک پاری ۳۰۰ روپے
معارفین سے ۱۵۰ روپے

مالک غیرے
۲۵ ڈالر - ۱۵ پونڈ

پیشکش کی گئی ہے اس کتاب کو پڑھنے والے کو ایک سال کی مہلت ملے گی۔

ہم عصر اردو ادب

[دو جلدوں میں]

اردو شعروادب کا ایک خوب سیرت عالمی گاؤں
۲۱ ویں صدی کے نام

تعمیر و تشکیل کے ناماً منظر نامے

باب طنز و مزاح، انشائیہ

طنز و مزاح اور انشائیہ کے ناموں قلم کاروں کی تازہ تحریریں۔ تازہ کا قلم کار۔ معاصر طنز و مزاح اور انشائیہ کی صورت حال، نگاہیں، تجزیے، اقتباسات

باب تراجم

تازہ ڈرامہ نگاروں کے سقہئے ڈرامہ نگاروں کے جدید ڈرامے، اردو ڈرامہ، اردو تھیٹر، ہندوستان میں تھیٹر ڈرامے پر ایک بھرپور باب

باب ناول - ناولٹ

کئی مکمل ناولٹ اور نئے قلم کاروں کے زیر قلم ناولوں کے ابواب۔ معاصر اردو ناول پر معلوماتی، تنقیدی، شعرا

باب سفرنامہ

سفرناموں سے متعلق ایک بھرپور باب۔ نئے سفرناموں سے دلچسپ اقتباسات۔

باب شاعری

ہم عصر عالمی ادب شاعری کا تخمینہ ترین انتخاب (غیر مطبوعہ) نئی نسل کے شعرا (۱۹۸۰ء کے بعد) مرحوم شعرا [۱۹۹۰ء کے بعد] نوواردان شاعری [شعری دریافت] بزرگ شعرا (کلاسیک روایت کے امین) مختلف شعری اصناف شعری تجربے ذیلی ابواب۔ شاعری کی اہم کتابوں کے تجزیے، تبصرے، حوالے اقتباسات۔ ادبی شخصیات ان کے علاوہ بھی بہت کچھ

باب مقالات

شاعری، افسانہ، ڈراما، ناول، تنقید، تخلیق، سوانح، طنز و مزاح، فنون لطیفہ۔ اور کئی اہم موضوعات پر فکر انگیز مضامین۔ ۵۰ سے زائد ناقدین ابواب نے ہم عصر اردو ادب کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔

باب افسانہ

۵۰ سے زائد شاہیر اور تازہ کار افسانہ نگاروں کے غیر مطبوعہ افسانے عظیم افسانہ نگاروں سے منسوب ذیلی ابواب ہر باب کی ابتداء ایک زندہ شاعر کہتانی سے معاصر اردو کہانی پر لکھی گئی اہم تنقیدی کتابوں کے حوالے، تجزیے اقتباسات اردو افسانہ: داستان سے کہانی تک (نیچے)

۱۹۸۳ء کے بعد کی پرانی پرانہ کہانی ایک بہت مشکل و مستند ادبی مذاکرہ جس میں ۵۰ سے زائد نئے افسانہ نگاروں، افسانوں کے نقاد اور افسانہ کے قارئین نے اردو افسانہ پر اپنی جلاگ بانی کا اثر دیکھا ہے۔

اس کے علاوہ افسانہ بہت کچھ

مکالمہ - مصاحب

کئی اہم ادب شاہیر تلم کاروں سے
دلچسپ مکالمے اور مصالحوں - مروجین کے
غیر مطبوعہ انٹرویوز

گوشہ

○ توقیت میر اور میر پر تحقیقی لوازم
○ توقیت سیما ب اور سیما بیات
○ محنت اور صدیقی خطوط اور شعری انتخاب
○ اعجاز صدیقی - ایک مطالعہ
○ نرگس دریدا - ایک مکمل مطالعہ
اور کئی اہم نام

اردو کی نئی بستان

اردو کی نئی بستانوں کے شعرو ادب پر تازہ
ترین مضامین، جائزے، معلوماتی
نوٹس - ادب بہت کچھ

بازیافت

قدیم و نایاب اہم کتبوں کے عکس
اور تحقیقی تفصیل

ادبی مذاکرے

○ ترقی پسندی کا نوال، نئی دانشوری اور
کئی سوال

○ جدیدیت اور ما بعد جدیدیت کے مسائل
○ شعری سے نثر کی طرف اور شاعری
○ نثر سے شاعری کی طرف اور شاعری
○ قاری اس کے شعرو ادب پر تاثرات
○ تاثرات

عزل پر تنقیدی مکالمہ

عزل پر شاعر کے ایک ہنگامہ خمیز
تاریخی ادبی معرکے کا اختتام - ایک
نئے تنقیدی آئینہ کے ساتھ - ۷۰ سے زائد
نئے پرائے تلم کار اس بحث میں شامل ہیں

بخط شاعر

ہم عصر شاعر شعرا کا کلام



یہ صورت گزرتی

خاص نمبر میں شامل قلم کاروں کی تصاویر و نام

سوانحی اشاریے

خاص نمبر میں قلم کاروں کے مستند حالات

آثار لفظ لفظ

مشاہیر کے خطوط (غنی) مع حواشی

نقد و نظر

○ کتب و رسائل پر تبصرے
○ کئی اہم کتب بول کے تجزیے
○ ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء کی مطبوعات

وفیات

○ مروجین کی غیر مطبوعہ تخلیقات
○ سوانحی اشاریے اور دیگر معلومات

چھوٹے چھوٹے یادیں

○ نایاب تصاویر
○ حوالے

ضخامت، قیمت، کتب و رسائل کے اشتہارات کی رعایتی شرح، اشتہارات کا نرخ نامہ
شاعر کے مستقل خریداروں کے لئے رعایتی قیمت، غیر مالک کے قارئین و قلم کاروں کے لئے رعایتی
شرح، کتب فروشوں کے لئے کمیشن کی شرح، خاص نمبر کے تمام ابواب میں شامل ہونے والے
قلم کاروں کے نام اور دیگر ضروری معلومات کے ساتھ بہت جلد

ہم آپ تک پہنچ رہے ہیں

مذہبات

۸ معاشرہ و تنقید چند سوال
۲۰ ہائیکو کی ہیئت کا اسک

۸ حادی کا شہری

۲۰ محسن ہیرا کے

نظمیت

۱۱ ایک نظم
۲۴ حجاب اور حجاب
۲۳ جلاوطن
۲۳ عقیدت میں

۱۱ راج نرائے مراد

۲۴ شبنم مناروی

۲۳ جمیل الرحمن

۲۳ فیاضہ رشتہ

کہانیاں

۱۲ انتظار
۱۴ فرض
۲۲ راکھ
۲۹ سیما میر ٹوئس
۲۳ حراست
۳۴ میری فرمائش! کیا تم تک میری آواز پہ پہنچتی ہے
[ترجمہ] ہندی

۱۲ سلطان جیل نسیم

۱۴ بشیر پر دیپ

۲۲ ساجد رشید

۲۹ منتزہات

۲۳ نور الحسنین

۳۴ دھرم داس تھانہ

جاوید اقبال

نثر

نظہر امام ۱۱

اکبر علی خان غری زادہ ۱۹ زبیر شفا نے ۱۹ قمر نقوی ۱۹
عبدالحمید ۲۸ ارمانہ نجمہ ۲۸ ساجد جمید ۲۸
بلال کمار ۳۲ اصغر رضوی ۳۲ اکرم کمالہ ۳۲
ناہید سلیم ۳۵ اطہر فاروقی ۳۵ مختار احسن انصاری ۳۵
شاہینہ اقبال ۴۲ فکیہہ عظمیٰ ۴۲ خالد جلال ۴۲
ہدایت کاشف ۴۲ امیر حمزہ ثاقب ۴۳ پردیپ ساحل ۴۳

مخطوطات

۱۵ زندگی کا تانا بانا
۱۵ غزل

عقیدہ شاداب

کشمیری لالہ ڈاکر

مکتوبات

۷ چارونسل

مکتور سعیدی

نثر

۴ [بنام] اعجاز صدیقی

صالحہ عابد حسین

جرائد

۴ عوام سے اردو کا رابطہ ٹوٹ رہا ہے

انتخاب امام صدیق

مکتوبات

دلپسنگ - عزیز اندوی - انیس ربیع -
اسلم صنیف - عتیق انظر عبد المجید برط
اختر یوسف - امین ایس علی - عمر جمیل
شرون گاردرما - سنی بدردیری - شرفا چوہی
شاہد انور - آمنہ ابوالحسن - محمود کشی -
مقصود الہی شیخ - شفیقہ فرحت سیما امجدی
منصور اعجاز - بلقیس ظفر الحسن - پرتال نگہ قیا
جاوید اقبال
۴۴

شمارہ - ۶ [جون ۹۵] جلد - ۶۶

عوام سے اردو کا رابطہ ٹوٹ رہا ہے

⑤

بیسویں صدی کی آخری دہائی بھی اب بٹنے لگی ہے۔ ہندوستان کی آزادی ملک کی تقسیم کے بعد اور بگڑتے ہوئے ہندوستان کی موجودہ صورتحال میں فنون لطیفہ کے خطرناکوں میں شعروادب کی وہ اہمیت نہیں جو آزادی کے قبل ہی تھی یا آزاد ملک کے اس پاس تھی۔ ملک کی آزادی میں زبانوں اور ان کے شعروادب نے جو بنیادی کردار ادا کیا تھا، آج وہ سب کچھ غائب ہو چکا ہے۔ آزادی کے حصول میں تنہا اردو زبان کا اپنی ایک زندہ تاریخ ہے۔ مگر آج اس تاریخ کو بھی کچھ بھاریاں ہیں۔ ختم کیا جا رہا ہے۔ ذہنی اور اخلاقی سطح پر پچھڑنے والی عوام کو ترقی یافتہ ملک کی نئی تہذیب سے ہم آہنگی کے بجائے کیا نام کی چیزیں کی جا رہی ہیں۔ آزادی کے قبل میں ہندوستان ملک کے خواب آزادی کے متواؤں دیکھتے تھے، سوچتے تھے، وہ سارے خوش خواب برسوں ہوئے ٹوٹ گئے، بگڑ گئے۔ اب تو جمہوریت کے نام پر طاقت اور غڈ گھردی کے تال میل سے برہم کا دوبارہ چمکاتے چلتے ہیں۔ دنیا کا ایک بڑا جمہور کو ملک، کا فخر پر ایک مثال ملک ہے لیکن ملٹی سطح پر ناکام جمہوری نظام کی بدترین مثال ہے۔ کسی جمہوری نظام کے لئے کس طرح کا سیاسی ڈھانچہ ہو چکا ہے وہ کم از کم ہندوستان میں تو واضح نہیں ہے درندہ اور دھیس جڑی اور زندہ زبان کو ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا۔ اسے کسی ایک قوم کے ساتھ بریک کر کے کی شوری کو کششیں نہیں کی جاتیں۔ تنہا ہندی کے ساتھ اس ملک کا کوئی بھی مستقبل منظر کشی کا کر سیکو کرزم کا تصور تنہا ہندی یا تنہا اردو نہیں ہو سکتا۔ ہندی اردو یا پھر دونوں کے رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی کو بچ بھی اب مناسی نہیں دیتی۔ اردو اور دوسری بڑی اکثریت دشمنی اپنی تیز تر ہے کہ سیدھے سادے اردو والے جو زبانی اور تحریری احتجاج کی سطح سے بند نہیں ہوئے ہیں۔ اپنی نوابی پریشانی کے ساتھ بہت زیادہ خوش گمانیوں سے باہر نہیں نکل رہے ہیں۔ دوسری طبقہ عوام کے ساتھ اردو کا تہذیبی رابطہ اب پس نظر ہوتا جا رہا ہے۔ ہندی کے نام پر بگڑنے والی فلموں میں گانوں اور غزل گائیکی میں اردو، حرف ہونے اور سننے کی سطح سے بھی پیچھے آ رہی ہے۔ اور اب میڈیا کی جھڑپوں کی دیرینہ برہم چوڑے بڑے، منہ درک پر درگاہوں میں، مائیل سے مکالموں تک بظاہر اردو کو بھی نہیں دیکھیں گے۔ فلموں میں تو بے فیصلہ اور دستاویزی کے جانے کے باوجود ہندی ٹی وی کے خلاف کسی بھی احتجاج نہیں کیا گیا۔ تو بے خیالات تو یہ ہے کہ فلموں کے کہانی کا مکمل ٹولہ یہ سمجھتے ہیں کہ فلموں میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی جبکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ فلموں کے مکالمے، گانوں کی طرح عوام میں مقبول ہوتے تھے۔ اردو فلموں کے بیشتر مکالمہ نگار، اردو زبان اور اس کے شعروادب سے پوری طرح واقف ہوتے تھے۔ وہ گوئیہن کی مادری زبان ہندی ہوتی تھی، اردو غور پڑھتے تھے۔ سکرانوں کو کس نے بھی یہ نہیں کہا کہ فلموں کی غالب زبان اگر اردو ہے تو پھر اردو ہندی کے سرٹیکٹ ملنا چاہیے، ہندی اردو کا سرٹیکٹ ملنا چاہیے۔ اب اگر آج فلموں میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں تو اس کی بڑی وجوہاتوں میں کوئی اور مکالموں کے بجائے ایکشن کے نام پر بددعاؤں کے خوبصورت مناظر اور بے نیکی گانوں کی بھرماریں عورت کے جسم کا بھرپور استعمال ہی رہ گیا ہے اور ان سب کو اردو گانوں کی پسند فرامد جا رہا ہے۔ تذکرہ وراثت سے جاری ہوئے روح مکالمے ادا ہوتے ہیں۔ ان میں بھی اردو مزاجی موجود ہوتی ہے۔ لیکن نظر اور لہجہ تمام تر ہندی آئینہ ہو رہا ہے لیکن اب بھی فلموں کے مکالمہ نگاروں اور گانے لکھنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو انگریز بنیادی کرتے ہیں تو اردو کے شعری مزاج سے قریب نہ بننے کی برہم حال کوشش ضرور کرتے ہیں۔ کچھ اردو شعاعی کرداریت سے وہ آج بھی کسی نہ کسی طرح جڑے ہوئے ضرور ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہندی کے نام اور ہندی کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے۔ موجودہ نسل اٹھانے والی فلموں کو مشترکہ تہذیب و کون سے دور بنایا جا رہا ہے۔ اب زندگی کے ہر شعبے میں ایک بڑے ملک میں خانہ بندی کا رجحان غور رہا ہے۔ زبان، مذہب، سیاست اور تہذیب کے نام پر ہم سب تقسیم ہو رہے ہیں اپنے اپنے خانے بنا رہے ہیں اور اردو والے ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں سے زیادہ معروف تو اردو والے ہیں (عوام نہیں) اردو کا ڈیویو، سرکاری اداروں اور اپنے بندے ہوئے چھوٹے چھوٹے محروم میں بٹے ہوئے اپنی اپنی ذیلی اپنا اپنا دارگا، کے مصداق بے طرح معروف ہیں۔ اردو کے خلاف عملی سطح پر جو کچھ ہو رہا ہے اس سے باقوبہ خبریں یا پھر برسی ریش ہی ملتا نہیں چاہتے۔ میڈیا سے پوری طرح بگڑنے والے اردو دانشورات نے یہ بھی احتجاج نہیں کیا کہ اردو کو بگڑنے والا ہونے والے مشاعرے کیوں بگڑ دیئے گئے [ہندی کو کیسین بھی بگڑ گئے ہیں لیکن اس سے ہندی شعاعی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ سرکاری زبان کے شعروادب کو کیا نقصان ہو سکتا ہے] عوام سے اردو کا رشتہ دن بدن کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اردو کی نئی نسل کے لئے یہ طے نہ ہوئے ہیں۔ نئی نسل کو آگے آنا اور اپنے بزرگوں سے الگ، اپنی زبان اور اس کے شعروادب کے لئے عملی طور پر وہ سب کچھ کرنا ہے جو بزرگوں نے نہیں کیا اور اب ان سے کوئی امید بھی نہیں کی جاسکتی کہ اب یہ سارے بزرگ منصب داریوں کے قابل ہی رہ گئے ہیں۔

انفیلڈ



ہر نفس اندر خود آگیا اندیس
کچھ کو دیتی ہوئی زندگی اندیس
ہر نئی دلت میں ماسر دگی اور میں
موسم کی دہی بے رنگی اور میں
ہر طرف شاہ آرتی ہوئی اور میں
اک سستی ہوئی روکشنی اور میں
لگ نظارہ، نظر سے گزرتا ہوا
ایک دول کی نظر رنگ اور میں
چند ہر چاٹیاں تھیں کرتی ہوئی
اک تماشہ، تھری تھری اندیس
جب بکھا ہے مجھے یہ بولے ستم
کچھ نہ چاہیں مری روشنی اندیس
آسمان کی کہ خود میرے پس آجکا
منتظر، میری درمندی اور میں
روزی شہر بھی جلوہ دشت بھی
میری بنا آوارہ گار اور میں
راستے آشت آشت سے، مگر
منزلیں، اجنبی گلی، اندیس
ہر قدم پر کوئی بے قدم ہو، مرا
ساتھ میرے یہ دیوانگی، اور میں
ہمکن مات، اور جب نہ نکلا ہوا
تن جلاتی ہوئی چاندنی، اور میں
پلاس برستی ہوئی، ہونٹ چلتے ہوتے
اس سے اک گز مٹی ندی اندیس
مجھے شہر مندگی ہے مجھے
دلت کی گیس بے معنی! اور میں
گھٹ کے مرنے کوئی اپنی تپیل
میری اک خواہش آخری اور میں
تبدیل ہوں تو قسم درجانی ہوں
اک غیب سے بولنے حس، اور میں

مانڈی کا کھن مرحلہ، اندیس
طے دھوتا ہوا ناستا، اندیس
کیا کہوں مجھ میں سب کا اور میں
قتل امید کا ستی، اور میں
منہدم، مجھے میں خود بھی ہوتا ہوا
اندھام طلسم دت، اور میں
سانسے رشتے غلاں بھرتے ہوئے
رہط کا ٹوٹا سلسلہ، اور میں
مجھ مجھے زیر کرتا ہوا
دبیدم وقت کا سامنا، اور میں
لذت ہم آرائی کا حاصل
زیر تنہائی کا ذائقہ، اور میں
وہ بھی بھگا ہوا، میں بھی کھو ہوا
مجھ سے کچھ ہوا ہوا، اور میں
اس نفا سے سلامت گزرتا ہوں
دوبدک فحاش فضا، اور میں
میں کہاں سے چلتا تھا، کہاں گیا
اب سحر سحر بھی کچھ نہ، اور میں
زندگی میں اب اس کے سوا کچھ نہیں
زندہ میرے کاک جھل، اور میں
راتے کا تماشہ سب کے لئے
مجھ پہ گزرا ہوا حادثہ اور میں
ہر تعلق، جدائی کی سوغات لئے
باد بار ایک ہی واقعہ، اور میں
دلت کی دگدگ، چاندنی ہمسفر
انکھ سے خیز کا نام، اور میں
شرک اک ہند بھٹن سے چرسہ
جنگلوں کی وحشی ہوا، اور میں
پاؤں تختہ دلدل میں دھنسنے ہوئے
سر پہ گہری گھیری گھٹا، اور میں

طنز کرتے یہ دیوانہ ورا اندیس
مجھ سے بڑے میری گھر، اور میں
رائیگان میرا سا سفر، اور میں
ساتھ چلتی ہوئی رگدڑ، اور میں
دہی دہستوں پر بھٹکتا ہوا
سرس آویزش خیر و شر، اور میں
بے کرل دل کے دیوانی طغیان
ہے اماں خواہشوں کے کھنڈ اور میں
ہر قدم پر میں کیکی نظر لئے مگر
کتنی تہلے میری نظر اور میں
لاکھ خوشیاں مگر کتنی نا معتبر
ایک میرا غم معتبر، اور میں
باد کا میری نوجو میرے گاہیں بھی جتیں
تھک گیا کہیں میرا سر اور میں
داس آئی ہے خانہ خرابی لئے
دو دیوں شہر میں دوبارہ اور میں
مدعا سے سفر کچھ دھمت سفر
بس بولتے سر پر گزرتے اور میں
ایک غصہ کر گئے ہر قدم پر مجھے
ایک افتاد ہر گزرتے، اور میں
مجھ کو، فضا اندل میں بھرتا دھول
میرے چلتے ہوئے بال پر اور میں
ہیں کس انداز سے قتل میں ہر دم
خون آلودہ شاہ و سحر، اور میں
باخبر لوگ مجھ سے گزرتا ہے
ساتھ میرا دل بے خبر، اور میں
مگن دلوں کی دجلت یہ تصویر ہے
چاندنی مات سونا کھنڈ اور میں
اب تو خود اس شہر میں کوہر ہو کر
سر پہ چلتی ہوئی دھوپ، اور میں

اپنی موجودگی کی طلب، اور میں
مجھ سے خالی سرے زندہ اندیس
زندگی، ایک بے کار مصروفیت
ہر نفس رحمت ہے سب اور میں
وضیع دنیا بچنا کچھ آسا نہیں
فحاش میرے جیسے کاٹھب اور میں
اس کے ہمراہ، ملنا جوتا کھی
بعد اس کے ملا کھوسے کب اور میں
چھٹ پر میں گئے تو ہر پنے کا کچھ
میرے اند کا قبر و غضب اور میں
چلی پڑوں راہ اپنی کالوں کوئی
وقت کی راہ دیکھو نہ آسا دنیا
تہمتوں سے کچھ آسو چلتے ہوئے
حزن انہیں نفا سے طرب اور میں
اس کی غفلت میں بھی آن گھر مجھے
طم سے پنا کر کہاں جاؤں، اور میں
قرتوں کا قصہ میری کچھ ساتھ ہے
دو دیوں کے یہ دغ و غیب اور میں
ہند جاناں کے آداب اپنی جگو
میری اک خواہش ہے ادب اور میں
کیا باؤل لئے یہ کھاؤل اسے
دل ماسر دت ہوئے لب اور میں
سر پہ موج میرے تہرٹھا ہوا
دھوپ میں سائیاں کی طلب اور میں
دیکھ نہات اپنے پہنتے ہے
ایک روتلہ رلقب اور میں
دیر سے ان کے آد کے ہی منتظر
نات کا منظر چاہی لب اور میں
آج تو اس بے نسب دد میں
منفعل میرا نا و نسب اور میں

مترجم سنی کو اپنا متعدد گرواں ہے۔ جہاں تک سائنات کا تعلق ہے یہ سائنات کے حوالے سے فن سے ہی طبع دیکھی جاتی ہے جس طرح یہ ثقافت کے دیگر مظاہر دیکھی جاتی ہے۔ سائناتی تنقید کے دو شعبے ہیں: فطرت کا سائناتی علم فطرت کے رشتوں کے ایک تجزیہ کی نظام کے تحت کی حیثیت سنی کے پہلے کثرت مان کے لئے خفا نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح سے فطرت کے فطرت سے لائق ہو جاتی ہے۔ لیکن یہی تنقید کے برعکس سائناتی فطرت فطرت کو قائم بالذات وجود تسلیم کرنے کے پہلے سائناتی سطح پر اس کے ثقافتی، عمرانی، فطرتی، اساطیری اور تاریخی رشتوں کی دریافت پسند دیتا ہے۔ گویا سائناتی پس سائناتی اور ساخت شکنی کے نظریات نقد بڑا طور پر فطرت کے سائناتی وجود کو اہمیت دیتے ہیں اور جہتی بنیادی تنقیدی اصولوں میں فطرت کے رشتوں کے ربط و تعلق سے سنی ہمت کی نشی، متینہ سنی کے فطرت کی شکست سنی کی لار کزیت اور فطرت کی ثقافتی سنی کو نمایاں کرتے ہیں۔ تاہم اس نظریہ تنقید کے عملی امکانات ایسی اردو میں ملتے ہیں کہ یہ اس کی شریات کے حوالہ دانا ہی ہے۔

مناظرین کراچوں کو اردو کے نقاد سنی فطرت اور انتقادی تحریکات سے متاثر ہونے کی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک سنی سے اہم بات ہے۔ بشریکہ سنی فطرت نقد کو حرجاں نہ بنایا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے (اور ایسا کیا جاتا رہا ہے) تو انتقادی خود فکر کی قوت جواب دے سکتی ہے۔ سنی فطرت نقد کے دلدادگان اگر استقامت کے گردنے کی محنت پر امر کر دیتے ہیں سنی فطرت کو اپناتے ہیں، تو پوچھا جاسکتا ہے، کہ سنی فطرت نقد سے کیا نکلے گا؟ کون برقی جا رہی ہے؟ کیا سنی فطرت نقد کی شکست سے ایک ایک سنی فطرت نظام نقد اخذ نہیں جاسکتا؟ کون ایسا فطرتی کہ سنی فطرت سے مروی ہو کہ ہم اپنے فطرتی دہشتے سے متاثر رہے ہیں؟ ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ میر اور غالب کے کام میں سنی فطرت کی کونسی ایک مددگار کرنے کی جانب توجہ کیوں نہیں کی گئی ہے؟ یہ سنی فطرتی فطرت کا کچھ اتنے ہی بڑے نقاد ہیں۔ انہوں نے اپنے کام میں اپنے تنقیدی شعور کا اظہار تنقیدی شکست کی صورت میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ اپنے تنقیدی دہشتے سے لائق یا تو نقادوں کے احساس کمتری کی غلامی یا ان کے رویے کے یک رخ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ یا ان کی سانی پسندی کا ثبوت ہے۔ کیا نقادوں کا یہ رویہ اردو تنقید کی تاریخی کا دائرہ دار نہیں؟

تنقید کے نام پر کتابوں اور مقالات کی جو کثرت دیکھنے میں آ رہی ہے، وہ خوش آئند تو ہے۔ مگر دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک تنقید کا حق ادا کرتی ہے؟ اردو کا دیو سنے کتابوں کی اشاعت کے مالی امداد انڈیا کے سلیٹن ادب کو بھی صاحب کتاب بنا دیا ہے۔ اردو نقاد ہونے کے دعویدار ہیں مگر یہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو کتابیں اور مقالے تنقید کے نام پر پہنچے ہیں، وہ *AKS ERT 770557* کے ذیل میں آتے ہیں۔ اور تنقید میں کمر پیکار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتے، سوال یہ ہے کہ موجودہ کاروباری اور صنعتی اندوڑی کے اقتدار شکن دور میں اردو کا دیو میں اسی دور کا حصہ بننے پر رضا مند ہیں؟ ان کا رویہ یہ ہے کہ تنقیدوں کی اشاعت پر صرف ہونے سے زبان اور ادب کی پاکیزگی ہو سکتی ہے۔

اور یہ سوال بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ قاری اس نوع کی تنقیدات سے اپنا دماغ اندوڑتے کہ تک اور کیوں روکا دے؟ ایسی تنقیدات سلیٹن کے علاوہ کیا نیت کی شکار ہیں۔ آئے دن رسائل میں جو تنقیدی مقالات شائع ہوتے ہیں وہ کون سا تنقیدی نکتہ مشکف کرتے ہیں؟ کیوں *770557* تحریریں ذہنی انکسار اور سنی کو ظاہر نہیں کرتیں؟

تنقید نگاروں کی سہل پسندی کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں دواد باؤں کی جانب دھیان دے رہا ہے۔ اول یہ کہ اردو تنقید کی روایت اب ماشاء اللہ سو سال کی ہے۔ لیکن اردو میں انگریزی کی جیسی مستند اور تنقیدی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ جیل جالبی کی تاریخی تاریخ کی اپنی اہمیت ہے، مگر کوئی ایسی جامع تاریخ نہیں ملتی، جو ایک ہی جلد پر محیط ہو۔ کیا کام ادبی نقادوں کا نہیں ہے؟ دوم، عام طور پر ہماری تنقید شاعری کی تنقید ہو کر رہ گئی ہے۔ دسے گویا چند نارنگ اور وارث موی کے چند مقالات فطرت کی تنقید سے متعلق ہیں۔ کیا وہ یہ کہ فطرت پر کوئی دیکھ تنقیدی کیفیت نہیں ملتی؟

مرجہ تنقیدی نظریات کا بارآمدی تو ایک حد تک مشتبہ ہے، تنقید نگاروں نے تنقید لکھتے ہوئے نو لیڈ انکوار، وضاحت، اصطلاحات کی برار، عبارت کزالی، منطقیت، بے رخی اور قاریت سے ان کی رہی ہوئی، انادیت اور سنی کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ کیا نقاد دماغ شستہ *AKS ERT 770557* انداستہالی زبان نہیں لکھ سکتے۔

مجھے کہنے دیجئے کہ میر شتر ماہر نقاد اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مضائقہ سے کام لیتے ہیں یا ہم نام کام ہے۔ وہ تنقید نگار ہیں

کے لئے ایک وقت تھا کہ میں اٹھنے میں جب مالی منتفع دوست نواز میمنہ ترقی، یا شہرت میں کے اعراض کی تکمیل ممکن ہو یا کسی سینا میں ان کی شرکت یعنی ہوا اس طرح کی تنقیدات تھا کہ دین کو ظاہر کرتی ہیں اور مجموعی طور پر ذاتی سانی اور علاقائی تعصبات کو ہوا دیتی ہیں کثیر کے مثال لیئے گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے یہ خطار دو زبان و ادب کے لئے کٹھن خدمت انجام دیتا رہا ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان اردو ہے، اور اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ جامعات میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے انتظامات ہیں۔ اردو کتب کی جتنی محبت یہاں کی تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں ہوتی ہے اور غائب نہیں ہوتی یہ لوگ کل ہند شاعروں اور ادبی سینا میں کام کر رہے ہیں۔ یہاں کے تعلیم کاروں نے اردو زبان و ادب کی ترویج کا سامان کیا ہے۔ کئی اداروں کے میماری میں جملہ نکتے ہیں جن کے ہی کثیری الاصل ادیبوں نے دادی سے نکل کر اردو زبان و ادب کو چار چاند لگائے ہیں۔ اور کتنے ادیب اور شاعر دادی میں رہ کر گیسوئے اردو کو سوار ہے ہیں۔ اور آج بھی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے کتنے ہی ملاحظیت طلبہ اور اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن کیا مسند عقیدہ پر چھٹی نفاذ حضرت نے بھی کئی کثیری نگار پر نغمہ اضافی ہے۔ [نور شاہ مر کے ایک مثال ہے۔ جہاں کہ گڑھا حامدی کا شری شاہ کیسے لکھا یا یہی متعبد دروہ بہار کے ادیبوں کے ساتھ روا ہیں رکھا گیا، اعلیٰ ادبی احمد جیسے معتد نقاد کو برس تک مسند تشرینہ کا چوٹ بننا پڑا تھا۔ کے ادیبوں کو کون نہ لگتا ہے؟

اسی طرح نئی نسل کے باصلاحیت تعلیم کاروں سے اخاصی برتنے کا جو عام رویہ اردو نقادوں میں طے ہے اس کو کیا کہیے۔ نئی نسل تنقید سے خوف نہیں کھاتی۔ وہ اپنے خاص سے زیادہ اپنے صاحب سے آگاہ ہوتا ہے۔ اسے شک ہے وہ نام نہاد نقادوں کی شان سے نازی ہے۔ اگر نقاد ان کی تخلیقات کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے عوداوار نہیں۔ تو یہ تنگ نظری نہیں تو اردو کیلئے؛ کیا نقادوں کو نئے تعلیم کاروں کے مستند ہونے تک انتظار کرنا ہو گا کیا وہ اپنی نگاہ تیز سے نئے نگاروں کی تخلیقات میں کب اور کون سے الگ الگ نہیں کر سکتے؟ کہیں ہمارے نقاد اس منظر سے اب غورم و غبر نہیں۔ جو دل و جود کو چرکتی ہے۔ لیکن کئی نئی نسلوں کے اس جذبے کے ۱۹۸۵ء کے پرتو پر جو نا پڑتا ہے۔ سامع نقادوں میں تعصب اور تنگ نظری کی انجھاواں ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں انہیں کئی اور تنقیدی نظریے سے سابقہ پڑتا ہے اگر اتفاقاً دوسرے تنقیدی نظریے کا حاکم ہوتا ہے۔ اس پر جوت ہٹنے کا اندیشہ ہو۔ تو ان کی جلد ہٹ دینے ہوتی ہے۔ وہ جزم و تعصب اور استدلال اور شاہد کی کو خیراد کہنے کی ذاتیات ہاتھ اندر دیکھ کر حلوں سے بھا درینہ نہیں کرتے۔ بجائے اس کے کہ غلات نقدی طور کا کھیلے ذہن سے مطالعہ کیا جاتا اور اگر اسے رد کرنا مقصود ہو۔ تو اسے لای قوت سے کام لیا جاتا، وہی عاماء و زویاء نہ آزمائے پر اتر جاتے ہیں۔ یہ مدعہ درجہ انوس تک ہے اور اس کی جھوٹی ضرورت کے ساتھ یہ ادب کے اس میں ایک وقت مختلف اور متضاد نظریات کی کجائی اور کارفرائی کا جواز خود ادب نرازم تک ہے تنقید کی مکہ ہند نظم اور سائنسی نامر لاہیں کہ جلیک ہی نظریے کا پابند ہو ادب شائے کے نظریات و معارف کا اختلاف ادبی اقدار کے فروغ کا باعث ہے مگر ہمارے نقاد حضرت چاہے نظریے کو حق و آخر قرار دیتے ہیں، دیگر نظریات یا کسی نے نظریے کو لا فاعل قرار دینے میں ملحق نال نہیں کرتے۔

آخر میں - سخن گستر ادبیات کے مصداق، لکھنے کے دیکھنے کے میں نے اپنی تنقیدی کتاب "مقام تنقید" میں اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے مقام تنقید کے نظری اور عمل امکانات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اردو کے نقادوں کو جتنی بڑے نام ہیں ان میں بعض فرد گزشتوں اور صرندوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ کام ہم نے نظریاتی جگہ بند پور سے آنا دیکھ کے پوسٹ غرض اور ایک نکتہ سے کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کام میں بعض مستند نقادوں کے علاوہ بعض مروجہ نظریات نقدی فرد گزشتوں کی نشاندہی کی گئی۔ میرا تنقیدی موقف یہ ہے کہ ادب اور غیر ادب میں تفریق کیا جائے اور ادب کو غیر ادبی معیاروں سے جانچنے سے اجتناب کیا جائے۔ میرے خیال میں مروجہ تنقیدات کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ تعلیم میں سانی دروہیت سے ابھرنے والی ناویدہ اور تجرباتی غشی فضا کے دید و دربان سے چشم پوشی کرتی ہیں۔ اور اس سے مراد سماجی، ثقافتی اور عصری معلومات کے استوار پر زور دینا ہے۔ جس پر چھٹا ہر کہ حق ہمارے اس نوع کی معلومات کا تقاضا کہ ان کی باہمیت سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے؟ نئی ایک منفرد ذہنی عمل ہے۔ جو تخلیقیت کا پروردہ ہے۔ اور دیگر تمام ذہنی عمل سے تنفس ہے۔ کیوں نہ کہ اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اسے تاریک، ثقافت اور علم کی میٹھی سے بھات دلا کر اسے اپنے آزاد، توانا، اور حرکت وجود سے ستارہ ہونے کا موقع دیا جائے؛ لیکن یہ بات تنگ نظر نقاد کے لئے سے کون کھواتر ہے گندہ ادب اور علم کو گڑھا کر کے کہوں کہ بڑا نڈھال ہے؟ ذہنی آزادی کی نعمت سے بھرپور شخص اس کی قدر و قیمت کو کیا سمجھے گا؟



راج نواشن سراز



مظہر امام

ایک نظم

اس نے کہا تھا:
بول رہی ہے، اور بھی کے
عجب الفاظ، صدا میں ماری
جو تخیل ہو میں، نیلے گنبد میں
جو تحریر ہو میں، لمحوں پر
جو محسوس ہو میں، سانسوں سے
نیل لگن میں۔ کچھ الگ ہے، میری ہیں
۔ آج بھی ان کو سن سکتے۔ پڑھ سکتے ہیں

اس نے کہا تھا:

شبداں رہے

شبداں رہے

● ۷۹۳۰۔ ایٹ ٹیلنگرا، نئی دہلی۔ ۸

تراہندہ، تری دانی بدعاے آما
ذوال تیرا مقدر، کمال کرتا جا

قطعہ

مرے عزیز! مرے نکلے چیں! مرے ناقد
مجھے شکارِ عتاب و حبلال کرتا جا

بہت سے تیریں تیری کللیں قید اب بھی
مرے ہو سے قبا اپنی لال کرتا جا

مرے ذوال پر کربشت آخری تسمیر
یہ کاریک بھی اسے لاندل! کرتا جا

کوئی سنے نہ سنے، عرض حال کرتا جا
بزرگ جواب کی خاطر سوال کرتا جا

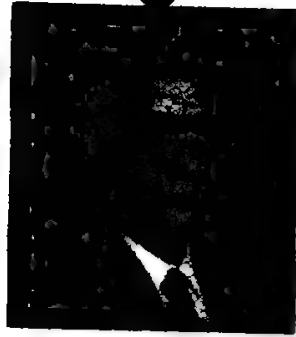
سمندر دلی کو ہوا میں اچھال دے اک بار
تو باہر ہے تو یہ بھی کمال کرتا جا

بدل دے ہجر کی ساعت کو وصل لمحوں میں
بنائے کام کو آساں محال کرتا جا

تری مثال میں کیا دلوں کے بے مثال ہے تو
مجھے بھی منہ بند دے مثال کرتا جا

شگست و فتح نصیبوں سے ہے "دلے دلے"
سطح میں زخم تو خود اندمال کرتا جا

ہیں ہیں ترا ماضی بھی سو رہا ہوگا
گندے والے! پس اتنا خیال کرتا جا



سلطان جمیل نسیم

۱۷۹۳ گشتن آقبال، کراچی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء

انتظار

اعتیاد اور مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے جیسے وہ آخری ٹوٹ ہے جس کو اگر کسی نے چھین لیا۔ یا بالآخر سے کہے کہیں گم ہو گیا، تو وہ بالکل محتاج ہو جائے گا۔

عورت اسٹیج پر آنے کے بعد حیرت اور پریشانی کے ساتھ آنے جانے والوں کو غصے سے دیکھتی رہتی ہے۔ پھر جھگڑے ہوئے کسی گندنی بوئی عورت کی جانب بڑھتی ہے۔ اور کبھی کسی مرد کی طرف، مگر ان کی تیز رفتاری اور ایک دوسرے سے لافانی دیکھ کر جھٹک پاتی ہے۔ ایک شخص نے در دروں کے غلبے میں کم تیز قدم بہت جیبت عورت کے قریب پہنچتا ہے تو اپنے آہ میں قہا ہوا کاغذ کا پردہ اس شخص کی طرف بڑھانے لگتا ہے۔

بھائی ا۔ ب۔ ذرا سنبھلو۔

عورت کتابت سے تیز وہ شخص جلدی سے صاف کر دیتا ہوا دوسرے لوگوں کی طرح تیز تیز قدم بڑھانے کے روشنی کے داؤد سے نکل جاتا ہے۔

عورت کے چہرے پر تھکے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ اس شخص کو آنے جانے والوں کی بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔ اتنی دیر میں دوسرا آدمی اس کے قریب آتا ہے وہ سب سے بہت انداز میں اس سے توجہ کرتی ہے۔

وہ بھائی صاحب۔

آدمی چلتے چلتے ٹھہر جاتا ہے۔ عورت کے جانچنے والی نظروں سے سب سے پاؤں کا، دیکھتا ہے۔ پھر کندھ اچکا کر کچھ کہنے سے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ عورت کو غیب کے بھنور میں گھومتے چھوڑ کر روشنی کا دائرہ اسٹیج پر آنے والے ایک ایسے آدمی کو نکالیں کہ وہ چلنے بڑھنے سے گزرنے والے ہجوم کا حصہ نہیں

بہت پر دھماکتا ہے تو اسٹیج اندھیرے میں ڈوبا ہوا دکائی دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ مردم روشنی چھپاتی ہے اور اسٹیج کی حد پر کینک کے استعمال سے شہر کی ایک معروف شاہراہ پر پہنچ جاتے ہوتے ٹریفک کو روک دینے والی اثرات کے اندر دھکیلا جاتا ہے چند لمحوں کے بعد صرف ٹریفک کا شور باقی رہ جاتا ہے۔ ہال کی روشنیاں بھی بجھ جاتی ہیں۔ تماشا خانہ اندھیرے کا حصہ بن جاتا ہے۔ تو اسٹیج کی مردم روشنی داغ طویل نظر آنے لگتی ہے۔

اب اسٹیج پر لوگوں کی آمد و رفت دکھائی جاتی ہے۔ سب تیز تیز چل رہے ہیں۔ اور اس طرح چلتے ہوئے کبھی کبھی ایک دوسرے سے ٹکرائے جاتے ہیں۔ مگر کوئی مصدمت کے بغیر جیسے کچھ ہماری نہیں چلتے کے ساتھ اپنے راستے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مردم سے اگلے میں روشنی کا دائرہ اسٹیج کے باہر طرف سے چلتا ہوا مرکز کے کنارے ایک پان والے کی دکان گنایاں کرتا ہے جہاں ایک آدمی دکان سے ٹیک ٹکٹے کھڑا ہے۔ اور دکاندار بڑی پھرتی سے پان لگا لگا ایک طرف رکھتا جا رہا ہے۔ آدمی اور دکاندار آپس میں باتیں کر رہے ہیں مگر تماشا خانہ ان کی گفتگو نہیں سن سکتے۔ کبھی کبھی ماہگیروں میں کوئی پان یا سگریٹ خریدنے کے لئے دکان کے سامنے آگے ٹھہر جاتا ہے۔

روشنی کا دائرہ راہگیروں کے ہجوم اور دکان کو کھلنے پر اگلے کا حصہ بننے کے ایک عورت کو اپنے چلتے میں لیتا ہے جو بائیں جانب سے اسٹیج پر آتی ہے۔ عورت کی عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ جویدہ لکھنیا باس نے تھک لکھنے ہوئے ہال، اور چہرے پر مارتی ہوئی پریشانیت سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ علیا سفر کو آئی ہے۔ عورت کے ایک ہاتھ میں کاغذ کا پردہ ہے جس کو وہ اتنی

متکلم اس نظر کا چہ تھا؟

آدی یہ بات سن کر اپنے دل لدا تھا کہ سچے پر ایسے رکنا ہے جیسے پہلے بڑے
درد کو سمیٹ رہا ہو۔ اور کہتا ہے۔

”ہاں۔ بلکہ نظر میرے پاس تھا۔“

عورت کی اضطرالی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ ہونٹ کاٹنے میں۔ اور تر تر
ہندہ چہرہ خود پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور شک بھرے لیے میں پڑ جاتی ہے۔

نظر تھامے پاس تھا؟ وہاں کہاں ہے؟

یہ سوال سن کر آدی کے سینے پر رکے ہوئے ہاتھوں گر جاتے ہیں جیسے بالکل
بے ہوش ہیں۔ پھر خود گالی کے انداز میں بولتا ہے۔

”سلام نہیں اب کہاں ہے۔ گم ہو گیا۔“

عورت ایک قدم اس کی جانب بڑھتی ہے۔ اور بہت ہی بے چینوں کے
ساتھ پوچھتی ہے۔

”گم ہو گیا؟ عمو کہاں؟“

جواب دینے کے بجائے وہ آدی سفرے پر سے ہنسنے لگتا ہے۔

صحت ختمہ میں اس کی طرف ایک قدم اس طرح بڑھتا ہے جیسے اس
کا رویہ بچنے لگا۔ پھر اس کا بازو بکڑ کر جھبڑاؤں ہے۔ اور تیز لپے میں
پوچھتی ہے۔

”بتاؤ۔ کہاں ہے میرا نظیر۔ بولو۔“

آدی کی ہنسی رک جاتی ہے۔ ذرا سی حنا روشنی کے بدر دھکی لہجہ میں
کہتا ہے۔

”یہ سلام ہوتا تو اصلے نہ ہوتا۔“

عورت چند لمحوں تک اکی کو ٹھونکتی رہتی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر
ہونٹ ہل کر رہ جاتے ہیں۔

تماشا فی سسٹم ہی جیسے وہ اپنے مکالمے بھول گئی ہے۔ پھر وہ اسے لدا
کاری سمجھتی ہیں۔ اور چپ بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔

خاکوشی کے ایک قلیل وقفہ کے بعد عورت پوچھتی ہے۔

”تم کو کہاں تھا۔“

مرد حیرت بھرے لیے میں پوچھتا ہے۔ کون۔؟

”نظر۔“ عورت نام ہلکے آدی کی شکل تک جاتی ہے۔

آدی نام سن کر چاندی دن گوم کے دیکھتا ہے جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

پھر تماشاؤں کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ عورت بھی اس کے ساتھ بیٹھ
جاتی ہے۔ اور پھر پوچھتی ہے۔

کتا۔ سست قدم ڈھیلے ڈھول باس، بڑھا ہوا شیشے، کچھ پانی عمر
ہو پاس کے گنگ بنگ اپنے خیالوں میں گم۔ خیال کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے
ہاتھ اپنے آپ سے ابھتا ہوا آدی جب عورت کے قریب پہنچتا ہے تو عورت
کے چہرے سے ٹکراؤ پریشانی کم ہو جاتی ہے۔

اور وہ خدا اعتماد کے ساتھ ٹکراؤ میں لجات پیدا کر کے مخاطب کرتے ہوئے فرماتا
آدی شہر جاتا ہے۔ مگر کچھ بولتا ہے۔ عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ عورت
اپنے ہاتھوں میں بچا ہوا کاغذ اس آدی کی طرف بڑھا کر کہتی ہے۔

”یہ نظیر کا پتہ ہے مجھے بتا دو اس پتے پر کیسے پہنچوں“

وہ آدی عورت کے ہاتھ سے کاغذ لیتا ہے۔ اور اس پلٹ کے دیکھتا ہے
تماشا فی سسٹم کی دستوری کاغذ کو اسے یا پھر وہ غصے پڑھنا نہیں جاتا۔

وہ آدی کاغذ کو اس طرح اپنی آنکھوں کے قریب لے جاتا ہے جیسے اس کی نظر
بہت ہی کمزور ہے اور کاغذ پر کبھی ہرگز عبارت اسے نظر نہیں آ رہی
ہے۔ عورت کہتی ہے۔

”بہت دن ہو گئے مجھے دھونڈتے ہوئے۔ چہ تھا، ہی نہیں۔“

یہ سن کر وہ آدی زور سے ہنسنے لگتا ہے۔ عورت اس کے ہاتھ سے بچا
جھپٹ لیتی ہے۔ مگر اس غصے پر عورت کی بے اعتباری کا کوئی اثر ہی نہیں

ہوتا۔ اس قہر لگائے ہوا ہے۔ اب عورت نے فخر وہ ہو کر آدی کی طرف
دیکھنے لگتی ہے۔ پھر وہ اپنے پار دونوں طرف دیکھتی ہے۔ اس آدی کے بے تحاشی

ہنسنے پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ لوگ خائف سستوں سے گریزاور
تیزی کے چلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

وہ شخص ہنسنے ہنسنے تنگ کر کھلتا گلاب جب کھانسی سمجھتا ہے
تو کہتا ہے۔

”یہاں تو کون کون سے پتے نہیں ملے۔ تجھے انہوں کا پتہ کیسے مل جائے گا۔“

عورت امت کے کہنے سے تیزی لپے میں کہتا ہے۔

”مجھے پتہ کون ملے گا۔؟ میں اس وقت پڑھوں۔“

اب آدی غصہ میں کہتا ہے۔

”پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تیرے پاس تو پتہ ہے چلی جا۔ پھر ایک دم غصہ

بجور میں بدلنا۔“ کسی نے پوچھنے شہر کا ہر آدمی بتا دے گا۔ اتنا
کہنے کے بعد اس شخص کے چہرے پر پار کی کد کینیت چھا جاتا ہے۔ اور

وہ دھڑک بھرے لیے میں اپنا ہاتھ نکل کر کہتا ہے۔

”میرے پاس تو پتہ بھی نہیں ہے۔ وہ بھی کہیں گم ہو گیا ہے۔“

”عورت حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اور پوچھتی ہے۔“

آدمی جگہ کرنا خد کا پندہ اٹھاتا ہے۔ اور اس پر تنوڑ اٹے بغیر
دوکاندار کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا ہے۔

”یار بہت دن ہوئے۔ ان دونوں کا یہ ایک ہی ڈالر دیکھتے ہوئے
یہ لوگ ان کے تو نہیں ہیں جن کا بیٹا مارا گیا ہے۔“
دوکاندار بان رکتے رکتے رک جاتا ہے۔ اور دیکھ کر بچے میں
کہتا ہے۔

”شہر میں دس پانچ آدمی روزی قتل ہو جاتے ہیں۔ اب تو ہم سوگ
منانا بھی بھول گئے ہیں۔ میں تو روز دھا ناگت ہوں۔ پر در دگا ماہی
ان میں رکنا کسی دن اسے قتل نہ ہو جائے کہ بازار کی بٹ کرنا پڑ
جائے۔ بازار بند ہو جائے۔ تو دوکان بند رہتی ہے۔ اور جو کھ کاٹھ
کھل جاتا ہے۔“

دوکان دار کے اسد جلے کے ساتھ ہی روشنی کم ہونے لگتی ہے
یہاں تک کہ اسٹیج پر موجود ہر شخص اور تمام کردار اندھیرے میں
ڈوب جاتے ہیں۔ تماشا یوں کے چاندوں کی طرف ہی اندھیرا پھیلا
ہوا ہے۔ اس اندھیرے میں تماشا کی اپنی جگہ خاموش بیٹھ جاتے
ہیں۔ ان کی سبھی میں نہیں آ رہا ہے۔ یہ دریا کی وقفہ ہے۔ یا کھیل ختم
ہو چکا ہے۔ وہ بیٹھے رہیں یا اٹھ جائیں۔

بقیہ صفحہ ۱۸ ختم

دینے کی رہے تھے۔ اکی ہی ہی۔ ۴۔
”اے عزیز میٹا۔ اب کی بار بھی تمہیں لپٹے رکھ لے۔“

اگلی بار آؤں گا تو کسر پوری کر دوں گا۔
اور رہ گھونے میں رہے پکڑ لے۔

اسی وقت اس کی نگاہ مکان سے نکلے ہوئے ایکسٹنٹ شادی
مشدد جڑے پکڑی۔ اس نے ماسوں کے بیٹے کو کبھی نہیں دیکھا
تھا۔ لیکن وہ سمجھ گیا کہ یہ ماسوں کا بیٹا ہے۔ اور اس کے ساتھ
ان کی بہن ہے۔

وہ دونوں دو قدم ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔
رنگو بولا۔

”ماسوں یہ تو بہن ہے نا۔؟ اور وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔“

اور ان دونوں کی طرف بڑھلا

وہ بے بہرہ۔ بے لے۔ ماسوں! میرا بھی تو کچھ فریض بننا ہے۔
اور اس نے اپنے میں پکڑے نہیں آ رہے ہیں کہ کچھ بچا ہے۔

”ظفر تم کو کہاں ملا تھا۔“

”ظفر ظفر بیٹا تھا میرا۔ میرا بیٹا تھا۔“ اناکھ کے بعد وہ باڈوں میں نہ چپا
کے رونے لگتا ہے۔ اس کا رونا بھی عورت کے گڑے اتنا ہی قہر ہے جتنا قہر
ملا تھا۔ وہ چند لمحوں تک آدمی کو نہ چھلنے دیتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔
پھر ملوث انداز میں اٹھ جاتی ہے جیسے اس آدمی کی باتوں سے عورت کے
روح میں اٹھنے والے ناسیدی اور سب سے قزاقی کے پھلے ترس گئے ہوں۔

آدمی اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھاتا ہے عورت کی طرف دیکھتا ہے گو گریہ
میں کہتا ہے۔

”میرے تو اس کو رخ کیا تھا۔ میں نے کہا تھا باہر آؤ میں چلی رہی ہے۔ کہہ
کہہ ڈھکے پتہ ہی نہیں۔ مگر اس نے بیٹھ کر میری بات نہ لی۔ میرے
دیکھا وہ گھر سے نکلا۔ پھر میں نے دیکھا وہ آؤ گئی کہ بیت میں آیا ہے پھر کھل
پھر گرا۔ پھر اٹھا۔ اب دیکھو۔ ان لوگوں کے چہرے دیکھو۔ کون کر گیا۔ کون
اٹھ گیا۔ ان کو چہرے دا سدا ہی نہیں ہے۔ سب اپنے کام میں۔ اپنے دھن میں
مگن ہیں۔“

رات کہ کے وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور دونوں انہوں کی سمت
اندھیرے میں چلے جاتا ہے۔

”اب میں آؤ گئی کو رو کر گا۔ میں اس کے سامنے دیوار بن جاؤں گا۔
اتنا کہنے کے بعد گھٹنوں کے بل اس طرف پیٹھ جاتا ہے۔ پیسے ڈے
ہو گیا ہو۔ چرلنے دونوں ہاتھ بھینکا کے اندھ لیتا ہے۔ اور اپنی ہماری
ڈوٹی کو آواز میں کہتا ہے۔

”میں آؤ گئی کے ہاتھ جوڑ دوں گا۔ میں کہوں گا۔ میں کہوں گا۔ بڑے بڑے
ہیں۔ ان کی آنکھوں کے بند پر دے ہوئے ہیں۔ ان پر دھڑکنا آؤ لے
جا۔ ابھی جن کے کچلے کھلے کھلے ہیں۔ ان کو جوڑ دے۔ ان کو جوڑ دے۔
اسٹیج پر نہ رہنا تاریکی کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ پھر اتنا اندھیرا چھا جاتا
ہے کہ اب اس آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ عورت جو ذرا دور کھڑی رہتی
ہے روشنی کا دائرہ اسے اپنے ہاتھ میں لے کر لے کر لے کر۔ عورت کے
کاپٹے انہوں کی کاغذ کا پرزہ لٹک رہا ہے۔ پھر وہ ہاتھ سے چھٹ جاتا
ہے۔ زمین پر گرا ہوا کاغذ کا ٹکڑا روشنی کی زد میں ہے۔ ہوا کا ہکا سا
جوڑ کا کاغذ کو آؤ لے ایک سمت لے جاتا ہے۔ عورت بے حس و حرکت
اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے کاغذ کا ٹکڑا روشنی کے دائرے میں اڑتا رہتا
ہے۔

پان تالے کے مکان کی طرف جاتا ہے۔ اب دوکان اور دوکان سے
ٹپک ٹپک ہونے لگا آدمی تیز روشنی کے دائرے میں اکھلتے ہیں۔

عقیل شاداب



زندگی کا تانا بانا

ایک جنزیرا -
- پانیوں کے بیج میں -
خواب آٹھوں کی امانت
جاگتی آٹھوں کے خواب

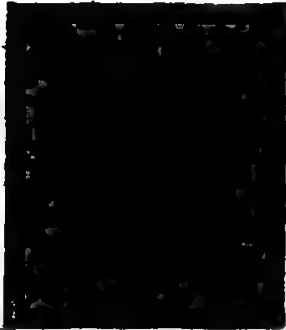
اور تعبیر ہیں
جھٹکتی پھر رہی ہیں دشت میں -
ہم سرائوں کے مسافر -
آزادیوں کی زد میں ہیں -
جسم کے صحر قومی ہیں -
کشتیاں کاغذ کے کیرجل ہیں
ایک اندیکھے سفر پر
ہر طرف متروک و خربہ

اور بخور ہے
اب جنزیر تک -
صفر ممکنہ نہیں ہے
پالکوں سے خوابوں کی چلیں نوا کر
انہی تعبیروں کی قبروں میں سلا دیں
نقش پانچ پر ہیں جو
وہ سب جٹا دیں -
سورج وادوں کو
جگا دیں -

اب جنزیرا چھ نہ بھرا
شہر خراج زندگی
ایک اور فاصلہ -
اور ایک سب زندگی کا
تانا بانا

● برج رابع پورہ، کوٹہ - ۹ - راجستان

کشیڑیلاں ڈاکر



اپنی تقدیر سے کچھ دیر خفا ہو ماروں
سوجھتا ہوں کہ میں اب تجھے جدا ہو ماروں
ایک لمحے میں بھر ماروں میں خوشبو بن کر
غذب ہو ماروں سواروں میں فنا ہو ماروں
اس بھری دنیا میں سو ڈھب کے خدا رکھے ہیں
سوجھتا ہوں کہ میں خود اپنا خدا ہو ماروں

میرے معصوم سے کردار بڑے اچھے ہیں
ان کو چاہوں تو کبھی ان سے خفا ہو ماروں
محبو تاریخ میں ڈھونڈیں یہ سورج مددوں
کاش میں رنگ خفا رسم دیا ہو ماروں

● ۳۶۷ - سیکٹر ۷ - ۴۳ - چند گڑھ

بشیش پردیپ

۵۵۵۔ لے اندھا نگہ، کھنڈ۔ (دیوٹی)

فرض

یہ کیا کم خاک و جینگہ لہنے شہر جوت نگر جانے تو اپنے بھانجے کو
کہہ نہ کہو مژدہ دے آتے۔ کبھی کہو نقد و پے۔ اور کبھی قیس نیکر ہا پا جا
کے لے کپڑا۔ وہ ان کا سا بھانجا بھی تو نہ تھا۔ رشتے کی ایک بہن کا لڑکا کا
خدا اس کا ماں سے جتنا بھی وہ اس کے لے آتے، بس اتنا ہی اپنا فرض
سمجھتے۔

رنگوب تین برس کا تھا۔ تب ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر
کمزور ہے۔ اور اپنی دونوں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے
باپ نے وہ سری شادی کر لی جب وہ کچھ بڑا ہوا تو سرتیلی ماں کے
سلوک کو دیکھ کر پریشان میں رہنے لگا۔ وہ تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔
نہ باپ نے اس کی تعلیم کی طرف دھیان دیا۔ اور نہ سوتیلی ماں نے۔ جو
سات ماہ ہی اسکول کی عمر گیا ہی نہیں۔ وہ دن ہر اوپر اوپر گھر کرتا
رہتا۔ لیکن اس کے گھمنے پھرنے میں اس کی شرارتوں کا یا آوارہ،
گردی کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ سرتیلی اس کی سن موری طبیعت نمایاں ہوتی
کئی کئی عمارت کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ تو کبھی ڈکدنگی پر تلنے والے
دکھ، پابند کا تماشا کبھی اسٹیشن پر کی چٹا پر بیٹھا ان گلا رتی
ہوئی گاڑیوں کو دیکھ رہا ہے جو اس چھوٹے اسٹیشن پر رکتی نہیں
قیس چیز سے گزر جاتی قیس۔ تو کبھی کسی میدان میں باکسی دھڑت
کے نیچے سما ہوا ہے جب نیزہ چورہ برس کا ہوا تو رات کو بھی گھر
سے غائب رہے لگا۔ شرور شرور میں اس کے باپ نے اسے
ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ تو وہ کبھی کسی مندر میں سو رہا تھا کبھی
کسی پیر و مرشد کے حزام پر پتہ چلتا کہ مندر میں دیر رات تک لیکن
کیرت سننے کے بعد ماں پر ہر مری تو ال سننے کے بعد وہ دیں
سو گیا تھا۔ اور اس کے بعد تو اس کے باپ نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش ہی
بچھڑی۔ پھر ایک دن اس کا باپ اور اس کی سرتیلی ماں

دونوں ہی ایک حادثے میں چل بسے۔ اور اب وہ بالکل ہی اکیلا
رہ گیا۔ اسے گھر کے ساتھ پہلے ہی کوئی نگاہ نہ تھا۔ لیکن ایک تعلق تو
ان لوگوں کے ساتھ بنا ہی ہوا تھا۔ یعنی جب کبھی اس کا بھی چاہتا تھا
سامان گھر ہی میں پڑتا رہتا۔ اور اب مسئلہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔
اس کی اپنی ماں کا کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ جو اس کی ماں کے
مرنے کے بدلے اس بھانجے کا خیال کرتا۔ ماں کے دور کے رشتے
کے ایک بھائی تھے جواب کان پور میں جا رہے تھے۔ انہیں اچانک
خیال آ گیا رشتہ نبھانے کا اس کے باپ کی زندگی میں وہ جب کبھی
اپنے شہر جوت نگر آتے تو اسے بھی دیکھنے چلے آتے۔ اور اب
باپ کے مرنے کے بعد گھرنے یہ مسئلہ اس طرح جلو کر رہا کہ ان کے
گنے پر وہ خود انہیں پر نام کرنے کیلئے ان کے پاس پہنچ جاتا۔
اپنے بے ڈھنگے سے ڈیل ڈول کے ساتھ بے کیف پڑتا رہتا۔
گرمیوں میں مرنے نیکر اور بنیان اور سردیوں میں ایک پرا نا جگہ جگہ
سے ادھر اُدھر سو بیٹھ جاتا کہ اس نے بنیان کے اوپر ہی پہنا ہوتا
اور پاؤں اس کے ہیشہ تنگے ہی ہوتے لے جاس دیکھ کر ماموں کو
قلبی اچھا نہ لگتا بلکہ کچھ گھبراہٹ سی ہوتی لگتی۔ اور کبھی وہ سرچے
میں سے بھاگ گیا معصیت مول لے لی ہے۔ جب اس خیل میں ہوش بھٹا
تھا۔ میں اس سے اپنا رشتہ نہ جوڑتا تو کن سامن پر جاتا۔ میرے بالے
میں لے پڑا ہی نہ چلتا۔ پھر وہیں مجھ سے ملنے تو نہ چلتا تھا۔ لیکن پھر
اس خیال آ جاتا۔ انسانیت کا ناٹ بھی تو کوئی ناٹ ہوتا ہے۔ اور
یہ تو پھر بھی رشتے میں بھائی بھائی اس کا اندھے کون۔؟ کچھ
نہ کہہ تو اس کا خیال کرنا ہی پڑتا تھا۔ اس سے ان کی ہر ملاقات
ان کے ذہن میں اس طرح کے منفی اور مثبت خیالات کو بجا کر
کرتے۔ جہاں تک دیکھو کا سوال ہے۔ تو اسے اپنے اپنے کے بلے

مہ چاہی۔ پیسے ڈر گئے۔
 "گئے۔ گئے۔ کیسے گئے۔؟"
 وہ دیکھ رہی تھی کہ سوراخ میں انگلیاں ڈال کر دکھائے گئے۔
 اور کھل کھلا کر ہنس دیتا۔

ہا۔ ہا۔ ہا۔ چاہی جیسے ہتھیلی سے چلا۔ اور چاہی تم نے بھی
 تو میری جیب نہیں دیکھی۔ لاؤ پیسے دو۔

تمہارا سامان ہا۔ دوں۔

"اسے ہتھ دے۔"

"انہیں چاہیں۔ چاہیہ دو۔ سامان لا دوں گا۔"

اور پھر چاہی اس کی جیب میں سی دیتی۔ اور دوبارہ جیب میں دیتی۔

اس دھت چاہی اسے بھلنے بھی لگتی۔

"دیکھو دیکھو۔ اب تو کچھ کام کیا کر بیٹھ۔"

"اسے آج مزدوری کی تمنا چاہی۔ دو روپے ملے تھے۔" اور وہ

اپنی جیب کو دیکھنے لگتا۔ چاہی سمجھ جاتی۔ وہ اپنے دودھ سے بھی

کہیں گنا آیا تھا۔

اور پھر ایک دن اسے کہنے بنایا کہ اس کے سامان کے

پیسے کی شادی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور شادی میں شریک

ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ لیکن ماؤں سے شادی میں مدعو

کرنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتے تھے۔؟ کہاں ان کے ہاں

شادی میں آنے والے ہتھ دشاؤں تھے۔ اور کہاں

وہ ان پڑھ گنوار۔ رگو۔ انہیں خیال ہی نہ آیا کہ ان کے اپنے

شہر میں رگو نام کا ٹکا کونسا بنایا بھی رہتا ہے۔؟

ان کے پیسے کی شادی ہو گئی۔ اور ادھر رگو بھی بھول گیا۔

کہ ماؤں کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی یا شادی ہو گئی ہوگی۔

اسی طرح اپنی روزمرہ کی زندگی میں مست تھا۔

شا دھکے دہا ہ بند ماؤں جو تھوڑے تو اپنے بیٹے

اور بہو۔ دونوں کو ساتھ پیسے انہیں اپنے شہر میں اپنا مکان اور

زمین دکھانے کے لئے اپنے مکان کا آدھا حصہ انہوں نے اپنے

لئے دکھا ہ تھا۔ اور باقی آدھے میں ان کا ایک کارنر اپنے پوری

پول کے ساتھ رہتا تھا۔ پول کی زمین کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ دن

بھر اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ اپنے مکان میں ہی رہے۔ بس ایک

بار ان کو ساتھ لے جا کر اپنی زمین اپنے کھیت دکھا لائے۔ وہ

میں کیا سوچتا تھا۔؟ وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ اس کے سامان کے

لیمہ اور اسے ان سے ملنے مزدور جانا ہے۔ اور جب سامان میں

تو اسے کچھ پیسے بھی دے دے۔ لیکن پیسے میں اور بعد میں

ان پیسوں سے کھانے پینے کی چیزیں خریدنے میں اور ان چیزوں میں

سے کچھ بچنے کے رکھنے کے بعد باقی کسی سپرد ہانڈے کے ہاں رہنے

فیصلوں میں اس نے دینے میں اسے ایک خاص مسترت ہوتی تھی۔

شروع شروع میں یہ رقت و رنٹ ہوتا تھا۔ وہ بے گناہ ہا۔

تھی بھرت لاد رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ یہ رقت و رنٹ بھی تھا اور اب کچھ

تیس برس کا ہو گیا تھا تو سامان سے پندرہ تیس روپے دے دیتے

وہ ہمیشہ سوچتے اب کی بار اسے کھڑا ہا۔ وہ دیکھ۔ لیکن ہر بار

ان کا یہ جذبہ سوچنے کی حد تک ہا۔ ہا۔ ہر بار انہیں یاد آتا

کہ انہیں فلاں فلاں کام کے لئے خرچ کرنا ہے۔ وہ پندرہ تیس روپے

سے زیادہ نہیں بچا پا سکتے۔

رگو بھی کبھی مزدوری بھی کرتا تھا اس شہر کے چھوٹے

اسٹیشن پر قلی گیری۔ یہ مزدوری کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر

اپنے آپ کی دھت ابھرتا۔ در نہ اسے بیکار گھومنا زیادہ اچھا لگتا تھا

یا پھر لگتی فلاں فلاں کام کر دیتا۔ ایسے کام جنکے کوئی

برائے برس۔ لیکن بھی چیز کے پائے کی ذرا ہش نہ ہوتی۔ یہ بات

ہے کہ ان میں سے کوئی اسے کھانا کھلا دیتا یا گھر میں کسی کا تہا ہا کپڑا

دیتا۔

"اسے رگو بیٹا! یہ بھولا۔ اس میں گھبرو ہے تھوڑا سا

کپے کی چٹکی میں پسالا۔ یہ لے پیسے۔ اسے پسوائی دے آنا۔"

"رگو بیٹا! یہ بھرت اور پیسے، نامک حلوائی کی دکان

سے دی لادے۔" ایک باؤ۔

"رگو ذرا ادھر تو آنا بیٹے۔ میرے ساتھ مل کر یہ سامان انور

رکھو اسے۔"

"جتنا رگو۔ یہ تو بھولا۔ اور پیسے۔ ذرا ایک کلر یا زولارہ

اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ کسی کا بھولا اور پیسے لے کر گیا ہوتا

ان اسے اس کا سامان لاتے۔ اور انہیں کی جیب میں سوراخ ہونے

کا دھچ پیسے کہیں گھر جاتے۔ اور اسے جیب ہی پتہ چلتا جیب سامان

چکا ہوتا۔ پھر وہ سامان وہ دکان ملو کہ برٹا کہ قریب یا جانا ہوتا

وہ بس آتا۔

دکھو ان کے پاس کھڑا تھا اور وہ لہجہ پرست پانڈو سے
تلاش کر رہے تھے۔ یہ ہم پر ایماندارانہ دوست تین تھے۔
اور اچانک ایک دھمکتے۔

"یہ تو سنیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔" وہ پانڈو سے کہتا تھا
کہ یہ ہم سے۔ اور یہ سنیں۔ وہ سوجھا کہ سو روپے کا نوٹ
دس دینا تو بہت زیادہ ہو جائیگا۔ "اسوں بڑے کے اندر
جہان کے ہر سو روپے سے تھے۔ اور دکھو ان کو دیکھ رہا تھا۔
"پیشے سے جیل روپ انگ لوں؟ نہیں۔ یہ ایک نیا ہونڈا
پیشہ کو اپنا نہیں کرتا۔ وہ لوگ تو اپنی ذات پر ایماندار
ہوتے ہیں۔ یہ تو دیکھو ان سے کہیں! آپ بڑے اور بڑے کرنا
ہیں۔ وہ سوجھا کہ سو روپے کا نوٹ دس دینا تو بہت زیادہ
ہو جائیگا۔

"پسے مینا۔"

"دکھو نے دس دس کے تین نوٹ ان کے ہاتھ میں دیکھے
تو بولا۔

"اسوں۔ مرن تیس روپے! تیس روپے میں آٹھ کل
کیا جتنے اسوں۔ اتنی نہیں لگتا ہے۔ اور ہر آپ سو روپے تو کچھ زیادہ

دیاں پر پیک نیک منانے کے موڈ میں تھے۔ جو کچھ سامان ساتھ لائے
تھے۔ اس نے کارمنس کی بیوی کے ساتھ مل کر کچھ ان بلتے ہوئے
مل کر لے۔

شام کو مینا دہانے پہنچے۔ مارتھ نے وہ دیکھا تو اسوں کو دیکھ
کا خیال آگیا۔ وہ جیسا کہ اب کی بار دیکھو ان سے ملنے کے لیے
آیا! "شاید اس نے نہیں دیکھا کہ اس سے اسوں آج ہوتے ہیں۔
چلو۔ ایک طرف سے آج آج ہوں۔ وہ پانڈو سے کہتا تھا۔ اور
کہتے ہیں کہ شیطاں ہڈیاں اور شیطاں ہڈیاں۔ وہ سوجھا کہ
پیشہ جتنے کہیں، جتنے جتنے جتنے جتنے جتنے جتنے جتنے
دکھو ان کو دیکھا تھا۔ ان کا بیٹا اور بچہ بھی گھر آئے تھے۔ اور پانڈو ان سے
میلے۔

وہ پرنام اسوں۔ "دکھو نیک کرنا اس کے پاؤں پھرے۔ وہ
سیلا۔ پانڈو، نیلی سی بنیان، اورنگ پاؤں۔ اس نے اپنے پاس
دیکھ کر اسوں کو پیش کی طرف مہجرات سی ہوتے گئے، پھر چاکلے پس
اس پر تریں اگیارہ اس کی حالت کچھ زیادہ ناہیلا اور
زنت انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک پانڈو سے روپ دینے پانڈو۔

پیش خیمہ اور سرب اندر سرب

پرتیپال سنگھ بیٹا

کے عرصے کے آئینے اور نیچے حسیئے کے حاملے اور غزلوں کا مجموعہ

خود رنگ

اجراء کے لئے تیار ہے
ضخامت: ۱۱۳ صفحات * قیمت: ایک سو روپے

ملنے کے لئے پتہ

الوطنش پبلی کیشنز: الف۔ گورو پڑہ، بخشی نگر، جہول توئی (جہول کشمیر)
انجمن ترقی اردو (دہلی)، اردو گھر، راولہ ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

پرتیپال سنگھ بیٹا



قمر نقوی

کچھ ایسا خواب آ رہا ہے۔
جس میں سب آسمان پر ہیں

میت ہوئی تو سوکھ گیا مہمان کا شجر
لیکن کئی پرندہ اجڑا، آسمان میں ہیں

شبہات سب اٹھیں سے میں شبنم کو تاج بھی
دو ایک تیر جو مری ٹوٹی گستاخیاں ہیں

اب کیا غفلت کل کی سنے کا دمدا کوئی
سب تو دمیدہ غنچے صفت لڑکھے ہیں

برہم سے امیر شہر کے گھر۔ جیسے ہی سنا، دھن دھن
وادی۔ شہر پر چڑھا، نماز گاہا، رہا

اپنے ہی شہر آیا روکے یہ شکار باب بھی گئے
جس طرح سارے اور کسی کے مکان میں ہیں

لیکن ہے ان سے پھر کبھی شعلے اٹھیں تو
پہاں کئی شہر ابھی اس خاکداں میں ہیں

6207 S. INDIANA POLES
TULSA, OK 74136 U.S.A.



زمین و شفائی

برسات سے بگولے گئے سرخاب چلے آئے
جب ہم نے بلایا ہے یہ سیلاب چلے آئے

پل بھر کے بند ہوئی تھیں مری آنکھیں
اُٹھیں کہیں اور گئی خواب سہلے آئے

اب میرے لئے ہو گستاخا باب مندور
موتی نہیں پتھر بھی سراب چلے آئے

میں نے طرف ماہ اڑائی تھی ہوا
دامن میں کہیں انجم شب اب چلے آئے

ہم ذیل ہوا اڑیں طوفان سے طلع
ساحل کی طرف گھوم کے گرداب چلے آئے

میں نے ذیراک سانس بہت زور سے کھینچی
آہستہ میں خود سانس نہ اجاب چلے آئے

● ۱۲ دہائی کا کوئی۔ جوئی۔ کا پور



اکبر علی خاں عرش زادہ

مژدہ باد لے کشت کاں تم سے ہم ہونے کو ہوں
میں بقدر حرف حق دنیا سے کم ہونے کو ہوں

روح کی اک جست نے رکھ لی بالآ خسر آہود
وہم سا کچھ سر میں یا خفا کہ خم ہونے کو ہوں

خود شناسی نے دکھائی ہے وہ راہ خود گردن
میں اب اپنے آپ ہی اپنا خم ہونے کو ہوں

آئینہ ہونے لگے ہیں مجھ میں سارے مادہ
آرڈر دہراں کے اٹھوں جاں جم ہو۔ نہ کو ہوں

اتنا اتنا، اتنا، اتنا، اتنا، اتنا، اتنا
ایسا نکلتا ہے کہ جیسے خود میں ضم ہونے کو ہوں

بل بول کر دستِ عمل تھا اور کیسا ازبند
آنکھ اب دستِ دعا ہوں اور قلم ہونے کو ہوں

● پھلوانہ۔ دیا پور۔ (لو۔ پ)

وہ اپنے احساسات اور جذبات کو آپس میں بانٹنے کے واسطے نام میں ظاہر کرتے اور بند کرتے ہیں چنانچہ میرا یقین ہے کہ بنوادیچراہم درجہ کے یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ شری دنیا میں بانٹنے کو اپنا دھرم سمجھ کر لکھے ہوئے ہے۔ (ص ۲۰)۔

بانٹنے کو اپنی اصلی زبان میں ہیئت، موصوف اور مزاج کے بارے میں بنیادی معلومات کے بعد اردو میں اس صنف سخن کی ہیئت کے قیاس سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ فرانسیسی اور انگریزی زبان سے اردو زبان میں در آنے والی اصناف شاعری و نظم و نثر کی ہیئت و مزاج کے نام اور مزاج کے بارے میں اردو شعراء کا رویہ کیا رہا ہے۔

شعری ادب کے سرسبز زمانہ میں بانٹنے کے نام پر شاعری کے نام پر شعراء اس کے کہ عہد حاضر کے معتمد شعراء نے ان اصناف کی اصل ہیئت کو اردو میں نہ صرف برقرار رکھا ہے، بلکہ تراشیے اور سائنت میں مصرعوں کی تعداد اور توانائی کے التزام کی تقلید کرتے ہوئے موضوعات کے تنوع اور زبان و بیان کی ان مراعات کا بھی بھرپور غور کیا ہے۔ جو پہلی پابندیوں کیلئے مشعریت اور زبان و بیان کے لطافت کے نام پر شعر مضمون کی حیثیت کھتی تھیں۔

چنانچہ درایت کے تسلسل میں ہم جاپان سے در آمد ہونے والی اس صنف سخن کی ہیئت اور مزاج کو اردو میں برقرار رکھتے ہوئے ہی بانٹنے کا نام دے سکتے ہیں۔ ورنہ اسے فقیر نظم کا نام ہی دیا جائے جس کا بجز قلم سے تقریباً نصف صدی پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ فقیر نظموں کا یہ قریب اردو ادب میں تیسری اور چوتھی دہائی میں کیا تھا اور نثریادہ صنف کے قیام میں اس فقر نظم پر مشتمل ہوا مجموعہ "فقیر نظموں" کے نام سے شائع کیا تھا۔ تارین کی دہائی کے لئے فقیر ترین نظم اور تین مصرعوں والی ہند نظموں درج کی جاتی ہیں۔

پارسی

ہندوستان میں گنگا دریا کے برستے ہوئے دہلی

برٹش

تو کیا جلتی تیرت سر پہ

دقت کا بجز خاگوں گلوں کو تا

کاٹ رہا ہے بال سفید

امید شکست

اک اور نادگنا ہے یہ بھر کے ڈوب گئی

نے اجازت دی تھی۔ وہ اصل ہیئت سے بہت دور جا چکا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ایڈریا ڈونٹس نے محسوس کیا تھا کہ ان کے والد نے مغرب میں نظم آزادی کی تحریک کسی منکر غرضاءوں کے ساتھ پہل اٹھانے میں جھانپا ہے۔ کہ نظم آزاد سے شاعرانہ ہیئت رخصت ہو گئی۔ (ص ۲۵)

اگلے جیل کر ہی باب میں یا سروسائے شکی کے اپنے مذکورہ موصوف سے ہٹنے کے بارے میں اس طرح تحریر کی ہے۔ جیسا کہ میں کہا جا چکا ہے شکی کے اپنے اصل موصوف سے اس حقیقت کے پیش نظر لکھا گیا کہ اس نے شعری ہیئت کے ہنگامے پہلو کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کے لئے اوزان میں کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اور اس طرح وہ نثر آہنگی کے قریب چلا گیا ہے۔ وہ پھر دیک (ناشاز، غیر دوپہا) ہو گیا ہے۔

پھر بھی ۱۹۳۷ء ارکان میں پابند ہے۔ اور پھر یہ طور پر اپنے آپ کو تعریف سے الگ نہیں کر سکا اس طرح کی قریبوں کا بڑا کھٹے ہوتے جہاں نام میں سمجھ سکا ہوں جیسے یا وزن کہا جاتا ہے۔ وہ نفس ایک عارف اور ان کی تہذیب بڑا یہ عہد تک نہیں چلی سکتی۔ وہ بانٹنے کو صرف ایک بے قاعدہ ہیئت ہے۔۔۔ بہت ترقی یافتہ شکل ہو یا غلطیادہ رجعت تہذیب کی نظر ہو یا بڑا بڑا کی بہر محبت کسی بھی قیمت پر مستقل قلم ہر ہرگز نہیں رہ سکتی۔ شکی کے محسوس کیا کہ بانٹنے کی ہیئت کا امکان ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ ہم اپنے شعروں کو عجیبہ

اور تہ دار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا ان کے ذریعہ کتنا ہی دار قصود ہمیشہ کتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم آخر کار پر نیکشیں تک محدود ارکان میں رہتے ہوئے ہی پہنچ سکتے ہیں۔ مرن ستر یا اٹھارہ ارکان (ص ۲۶) اسی صنف کے آخری پیرا گراف میں یا سروسائے شکی نے بانٹنے کی سترہ ارکان کی دعاوی طوالت کو تبدیل کرنے کی تمام کوششیں مایوسانہ ثابت ہو چکی ہیں۔ ادب بانٹنے کی سترہ کی نظم کی بنیاد فریاد کو سمجھ لگے ساتھ پہنچا نہیں کیا جاتا، اس کے جیل کر یا سروسائے شکی نے ان بیان کا تاثر

کے طور پر عہد حاضر کا بھی حوالہ دے کر لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے "شاید اس سے بوجہ وہ جدید کے غیر بانٹنے کو شام کو کسی تالیاں بانٹنے کی ہیئت کی بنیاد دی دہر کے بارے میں اپنے ایک سادہ اور واضح بیان میں کہتا ہے "میر نے ایک فکر کا فقیر ہیئت میں انہماک کیا تھا کہ یہ۔ یہ ٹیکنیک بنات خود ایک دو صوبہ کو منتقل کرنے میں اپنی دل ادا کرتے۔۔۔۔۔ لوگ عام طور پر بانٹنے کی سترہ کی حیثیت کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ جو ۵۰۰۔۔۔۔۔ کی ترتیب میں جن مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔



شبہم منادری

حجاب اندر حجاب



جمیل الرحمن



فیاض رفعت

خواب میں ڈرتے ہو تم! خواب آدھی زندگی ہیں۔ زندگی کے ہم نوا جسم کے اعضائے خواب ہونے کے عجب اعزاز ہیں چند ہو جاتے ہیں کچھ بیدار رہتے ہیں بڑی ترتیب سے خواب بیداری کے رشتے سے عبادت ہیں سبھی خوبصورت ساعتوں کا بھی یہی انداز ہے خوف گرنے کا، بدن سے وحشتوں کا سابقہ دشمنوں کے وار اپنوں کی قربت داریاں بے محابا جسم کا طاقت، حجاب و انفعال پانیوں کے ساتھ سائے کا تعلق گاہے گہرا، گاہے تیز سانپ چھوٹے ہیں۔ حسین اول کا ساتھ جسم۔ بے باہر تعلق جسم کا موت کی وحشت، جزیرے، بارتیں گاہے اڑنا، گاہے شل اپنا وجود ہم کبھی خوش اور کبھی غمگن ہیں جسم بیداری کے عالم میں بھی جب کھونے لگے خواب میں جب خواب کا دوراں ماہوئے لگے زندگی پاکیزگی کی کرند کرنے لگے اپنے خوابوں کو بنا لیتا تنہا زندگی خواب کے پردوں سے پھر اہر نکل آؤ گے تم!!

● پلاسٹک جس ۳۰-۲۷، ریاض ۱۱۴۱ھ (مستوری ۲۰۲۰ء)

جلا وطن

عقیدتیں

روزِ شام ہوتے ہی لوگ جب پلٹتے ہیں دوسرے دیواروں سے سوگوار پڑوں کے ہونٹ کھینچتے ہیں کتنے زیر لب جیلے راہ بھول جاتے ہیں جیتنے میں دروازے غمگین ہیں دیواریں جتھروں کی بارش میں جس نے شہ تھپو! اتنا آج بھی نہیں لوٹا

تم اکیلی تنہا نیم روشن کمرے میں دھڑکتے دل کے ساتھ لفظوں کی روشنی کو اپنے ذہن و دل کے چاند نگہ میں اتار رہی تھیں غنیمتوں سے سنوار رہی تھیں یہ جانے بغیر یہ موچے بغیر کو عقیدتیں نئے موسم کی طرح دقت کی دھول میں کھوجاتی ہیں۔

● اسٹیشن ڈائریکٹ آکوادہ رشتہ، پانچی گو

KORMELINK WEJ-44
1106 NS-AMSTERDAM, HOLLAND



ساجد رشید

معرفت روزنامہ اردو ڈائریکٹر - مولانا آزاد روڈ - بمبئی ۲۵

ساکھ

(فرحت شہزاد کے نام)

تھی۔ اور اس عورت کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھی جو اپنی سوتلی ساری سیلوئس بلاؤڈ اور پیٹنڈ لیم کے چھوٹے کپڑے سے کوئی آرٹ کرٹیک معلوم چھوڑی تھی۔ اس عورت کے چل جانے کے بعد شمع نے جال کے قریب جا کر اپنا تالان کرتے ہوئے تصویر کی تعریف کی تھی۔ دوران گفتگو اس نے بتا دیا تھا کہ آپ اسکو آن آؤش میں الٹ کر رہے اور لازمت کا یہ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرے روز جال نے سچے سچے انکو لیا جا کر شمع کو دہی تصویر غنہ میں پیش کی تھی۔ دونوں کی رسمی طاقا میں دوستی اور دوستی جلد ہی محبت میں بدل گئی تھی۔

جال اگر جتیاں کہاں ہیں۔؟ جال نے گون گھما کر دیکھا اس کا نوٹو گرافز دوست منوع تھا۔ جال نے وال کینیٹ سے اگر تھی سا پکیٹ نکال کر منوع کو دیا۔ منوع نے اگر تیاں شیشے کے ایک گلاس میں ڈال کر شمع کے سر پر لٹکا کر رکھ دیں۔ دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا۔ نقاشی ایسے عقلی ہونے لگا جیسے کربے کے پوچھل ماحول سے وہ بھا نسر وہ ہو۔ منوع نے جال کے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ کیا تم نے اپنے ڈیڑی کو خبر کر دی ہے؟ جال نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور شمع کے بابا کو جال نے سر جھکا دیا۔ شمع کے بابا کو اس نے داد ہندو کالون میں خود جا کر خریدی تھی۔ انہوں نے شمع کی صحت کی خبر ایک سنگین خاموشی کے ساتھ سنی تھی۔ اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر لیا تھا۔

”شمع اور میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ جال کے اس جملے پر شمع کے بابا نے اپنے جینیٹوں میں انگوٹھا ڈال کر اسے دو بار ادا پر پہنچا کیا۔ اور پھر مٹے جتنے کے ایک کپڑے سے لے محو دستے ہوئے جتنے

”تم جلد سے ہم لوگ پونیریا بہمن مہدی سے تپائی پونے میں اس عورت کی جگہ لے لو۔ اور تم کو کہیں کہیں۔“ اور پھر ایک ماسٹاماری

بیماری اور موت کی کوئی شمع کے چہرے کی کشش کو ختم نہیں کر سکتے۔ جال نے نظر اٹھ کر رکھی جو اس کی لاش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ شمع کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرٹ چہرہ دکھاتا تھا۔

شمع کی تھکن سہا ہیکس جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ ایک ایک اس کے سر پر سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شمع نے پتال اٹھا کر کرنی کا ایک گھونٹ لیا لیکن اس کی ہیکس پرستور جھکی رہی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ میرے بعد آجکام گیا۔ میں بہت سیر پھیل کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

جال نے شمع سے کہا۔ میں تمہاری بات کہی تھی۔ لیکن شمع نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ صرٹ جبر جبر سے کر رہی تھی۔ جال کی اس خواہش کو سن

کر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ رٹ دی کے اس تصویر سے اسے بھار سا ہوتا تھا جیسے ساری دنیا کی حرکتیں محفوظ تھیں۔ بابا کو اگر چہ جلد گیا کہ ایک مسلمان لڑکے سے وہ شادی کرنا چاہتی ہے تو۔۔۔۔۔ سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی تھی۔ دو برس قبل جال سے اس کی ملاقات ایک ڈوگرانی ایگری بیٹن میں ہوئی تھی۔ جسے نین اپو نوٹو گرافز نے لی کر ترتیب دیا تھا۔ شمع کو ایک تصویر ہے۔ حد پند آئی تھی جس کا عنوان تھا۔ ”زندگی“ جس میں ایک نکال کو سمندر کی بھری موجوں سے کچھاد پر پردا کرنا دکھا گیا تھا۔

شمع نے جب ایگری بیٹن سے نام سے اس ڈوگران کے لیے میں پوچھا۔ تو اس نے چشمہ لگائے ایک ساٹھ گز جوان کی طرف اشارہ کیا تھا جس نے ایک ٹیبل ڈھال ٹرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ ایک عورت سے ہنس رہی تھی کہ باتیں کر رہا تھا۔ جال کو ایک مردہ تصویر پر بابا کیاد دینے کا خیال نہ لگ کر کے وہ جب گیلری کی سیڑھیوں اترنے لگی تو اس کے سامنے ایک فنکار کا نقشہ تھا۔ وہ لوٹ ایگری بیٹن والی میں آگئی



گندہ شمع نے ایک روز غارِ شمس سے بقیہ کے کپڑوں کے ساتھ مگر اہم مذہب دونوں کو چھوڑ دیا۔ حالت سیدیں کمر پر ہر ذکر و شمع کلکرتی سے شمع جال ہو گئی۔ سید ہی جمال اہل شمع کا نکاح ہوا تھا۔ جمال کی بڑی بہن نے کمرے میں شمع کے روضہ جہم کو دیکھتے ہی ایک جلی دی چھ مار دی۔ اور جمال سے پٹ کر دے لیں۔ جمال کی آنکھیں خشک تھیں۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سینے میں کوئی ذلزلہ ہتھر کا ہوا ہو۔

بکے ہو گیا جمال؟ وہ روئی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔
 "خدا کر بھی منظور تھا ایسی احوال رکھتے۔"

بڑی بہن نے دھپتے سے آنکھیں خشک کر کے اپنی والدہ محترمہ کی بکیت دریافت کیا کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے۔ پھر اس نے مراضی ترجمہ دے قرآن کو کتب پورٹس آوار اور شمع کے قریب بیٹھ کر صفحہ دس آواز میں تلاوت کرنے لگی۔ شمع جلی رہی تو نہیں پڑھ سکی تھی البتہ کبھی بجا قرآن کا مراضی ترجمہ مڑوٹھا کرتی تھی۔

جمال کو اس درمیان نکاس ایڈورٹاٹھ ایجنسی میں سینئر فوٹو گرافر کلچر لگ گیا تھا یعنی نے ہی اسے پوری جلی میں مشکل لوم کا ایک ٹکٹ لٹا کر دیا تھا۔ عمارت میں بیوی کیلئے کافی قند دھاس ٹیٹ میں شمع کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن چلتے کے روز دونوں محمد علی روز جمال کے والد کے مکان پر مڑوٹھا رہے تھے۔ شمع نے ایک روز سوچا کہ اتنا مڑوٹھا گزر چکا ہے۔ اما نہ ہی آئی (ماں) نے تو اس کو مسات کر دیا ہو گا۔ وہ جمال کو بتاتے ہیچونو کلک سے فارغ ہو کر دادر ہندو کا لونڈی بیچ گاڑ ڈرواز سے پر مڑوٹھی جلی جاتی رہ گئی یعنی کی نے دروازہ نہیں کھولا۔ رشاید آئی ہوئی سے اسے دیکھنے کے بعد ایسا کیا ہو۔ اس کے بعد اس نے پھر کبھی ماں کی دلہیز کا رخ نہیں کیا۔ شمع نے خود کو جمال کے گھر کی تہذیب کے مطابق ڈھلنے کی پوری کوشش کی تھی۔ رمضان کے روز اس نے پہلی بار رکھے۔ لیکن مشکل دار کے مدت کا اس کا معمول برقرار رہا۔ جمال جب تک گھر نہیں آجاتا۔ وہ کانا نہیں کھاتی تھی۔ اس نے بے حالت اپنی آئی سے پانی پیتی تھی۔ آئی کا کرتی تھی۔ پتی پر مشورہ ہوتا ہے تھی کہ اس سے پہلے کانا خون کانا کانا پانی کے حال سے لے کر آواز سبھا کر اس کے کھانے میں اس قسم کی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اسے وقت پر کانا لینا چاہیے۔ لیکن وہ سیدہ ہی کرتی جاتی۔ ایک کھیت تھی کہ جو کھیت ہو جاتی۔

طمان... جمال اس سوال کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس نے فوراً کہا میں دھرم دل لیں گا۔ جمال کے اس جواب نے کچھ عرصہ ماں کے ساتھ چھپ کر دونوں کی باتیں شمع ہی شمع کے دل کے بوجھ کو کم کر دیا۔
 "کوئی بھی غیر ہند ہندو نہیں بن سکتا۔"

"اور اگر میں کر یہ سماجی طریقے سے ہندو بن جاؤں کیا تب بھی آپ مجھے سویکار نہیں کریں گے؟"

"نہیں کبھی نہیں" بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ مگر کس دھرم میں پیدا ہو گا یہ انشور کی اچھا سے ہوتا ہے۔ انسان کی مرضی سے نہیں سمجھتے۔"

دوران گھٹو شمع کی ماں نے جمال کے لئے اپنی چوٹی بیٹھ کے ہاتھ سے جب اسٹیل کے گلاس میں پانی بھرا دیا۔ تو بابا نے بڑی حالت سے لڑائی سے کہا۔ شیشے کے گلاس میں پانی لاؤ جمال پانی پئے بغیر ہی دہان سے اٹھ کر چلا آتا تھا۔ دوسرے روز جمال کو شمع نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے پہلی بار پتہ چلا کہ بابا مسلمانوں کو سخت ناپسند کتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "اگر کسی ماں کے ساتھ ہی بھاگ جاتے تو مجھے اتنا دک نہیں ہو گا جتنا ایک بیٹے کے ساتھ شادی کرنے سے ہو گا۔" کھتے ہوئے شمع مڑوٹھی تھی۔ میں نہیں کھانا چاہتی تھی۔" بچکوں اس کے کندھے پہنے لگتے تھے۔

اسی روز جمال نے اپنی والدہ کو شمع کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو خاموشی سے اپنے جوان بچے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہی۔ پھر کہا۔ "اگر وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ تو میرے خیال میں تھوڑے دنوں کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روزی قند با۔ لیکن ذرا سب تبدیل کرنے کی تجویز اس کے ملنے رکھنے کی بہت وہ اپنے میں جتن نہیں کر رہا تھا۔ ایک روز مسعود ریڈیو نمٹ میں جمال نے کھانے کے لئے شمع کو پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ اس کا خشکی دار کلا بہت ہے۔ وہ مرنے لیا جاتی ہے کہ جمال نے کوئی ختم کر لی لیکن وہ اپنا منشا بیان نہ کر سکا۔ شمع نے بیویانہ کے گلاس پر ابھر آنے والے اجرات کی بوندوں کو انگلی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میرے بابا تمہارے ہندو بن جانے کے بعد تمہیں سویکار کرنے کیلئے تیار نہیں رہے۔ تو میرے بچے کے لئے یہ ہے۔ میں ہی مسلمان ہو جاتی ہوں۔"

وہ سورج میں غرق ہو گیا تھا۔ رات بھر اتنی جلدی کہ

ہتھی ہے۔ تو اس میں پہلے بیسی کشش نہیں رہ جاتی۔ لیکن شادی کے بعد بھی دونوں کی قربت میں نہ مروت شدت آگئی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بیزاد محراب محسوس کرتے تھے۔

کمرے میں شمع کے بجائے جان جسم کے قریب ہی جالی اندر کچھ دھڑ رشتے دار عورتیں اندر چٹیاں قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ ابو ابراہیم بھی بیوی کے لئے تھکے تھے ان کی ترشید راتیں بھر روتی رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں سو جی ہر پٹی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی جمال کیسے سے نکال بھیج دیا جیسے اس کے سینے کا سامان دریا اپنے پلے میں آنا لینا چاہتی ہوں۔ تب بھی اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔

بچے خفا کہہ کر میں نے خبر گیری ہے۔ وہ بس آتی ہی ہو گی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو پوچھتے ہوئے کہا۔ ابو دروازے کے قریب سونے کے دوسرے کمرے کے ساتھ کھڑے ہوئے اپنی بیوی کی غصہ آری اور گھر میں کی تقریبیں کر رہے تھے رمضان کے پہنچے ہیں بہت سارے روزے رکھے اندر پاؤں رت نماز ادا کی کوئی گہری توں سکنا تھا کہ وہ غیر توہمت آئے تھے میت میں آئے والے بھی مڑوہ کہ انہیں صفات پر قرین علامات ادا کر رہے تھے۔

گذشتہ ایک پہنچے سے شمع کی محبت خواب رہنے لگی تھی ڈاکٹر نے رفیقان تشخیص کیا تھا۔ بیماری کے ٹھیک ناک میں نکل گئے ہیں یہ بھی بیک وقت تھی۔ کیوں کہ شمع کی محبت نے جمال کے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا یہ بیماری اتنی خطرناک ثابت ہو گی۔ دہ دہ دہ دہ سے چپٹی کے خود ہی اس کی نگاہ اشتکاتنا رہی سبب خفا کہ اس نے بیماری کے دنوں میں بھی شمع کی شکل دار کا برت رکھنے سے نہیں روکا۔ دہ دہ دہ دہ قبل شمع کو دن میں چار پانچ گھنٹے ہوتی تو وہ رونا سنی ہو گئی اس نے جاکت کہا۔ دیوہی میں اپنے لپے لپا اور آن کا شیر واد لینے نہیں گئی تھی ناشائدا اسی کا پاپ ہے۔ یہ جہاں نے اس بات پر اسے بہت بڑی رٹاٹ جاتی تھی کہ وہ پرمسنگ ہو کر

اس طرح کے دہم کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ وہ ہمہ با حقیقت میں نہیں جانتی لیکن پھر تب میں یہ ادھوا شمس دہور ہے میری ادویہ دے۔ یہ میرا دہ خنہ ہے کہ دوسرے جن میں ہیں دھبے تمنا یا ہی تپتی پلٹے۔ اس جگہ پر جمال نے بنا خیر نگاہ سے گمراہی کی پیشانی پر دم لگ گئی۔

کل رات اچانک ہی شمع کی محبت مجھ کو ڈاکٹر کو بلایا

گیا۔ ڈاکٹر نے انکشن اور دوائیں دے کر اس خنہ کا اظہار مزور کر دیا تھا کہ یہ رفیقان اپنے آخری اسٹیج پہنچے اس نے شمع کو کل سویرے ہی کسی لپے اسپتال میں داخل کر دیا بہت مزور رہی ہے۔ بالکل صفحوں میں نکال کر رات کاٹ دی گئی۔ انکشن کی وجہ سے شمع گہرے نیند مزور سوئی۔ لیکن صبح جاگنے کے بعد اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔ شمع کی ایسی حالت دیکھ کر جمال برن من دوس ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی شمع بگڑ گئی تھی۔

”جیتے تمام لوگ آپکے ہیں۔ غائبانہ میت کو غسل نہ دے دیا ہے۔ ابو جمال کو قریب بلا کر بولے۔ دھنکے لے گیا۔ سوچا کہ مزور بدایا غشاء بعد؟

انہیں جواب دینے کے بجائے جمال شمع کی لاش کو دیکھنے لگا۔ جسے غسل کے بعد کفن پہنا کر دریا کے لئے رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد چہرہ اب اور نکھر آیا تھا۔ اسے نکلیجیے وہ ابھی اٹھ کر کہے گی حد اسے مجھے بگڑا کیوں نہیں؟ ڈاکٹر جینے کے روز جمال پہلے اٹھتا تو خود ہی چلتا باک نہ پاتا تھا۔ شمع کو گہری نیند سے جگانے میں اسے اسے شکلف ہوتا تھا کہ وہ ہفتہ کے چھ روز بڑے سویرے اٹھ کر ٹھکے لام کاچ میں جٹ جاتی تھی اسے دفتر میں اور کال جاتے کی پازاری میں اسے کافی رت لگتا تھا اس نے عام دنوں میں تھک سورت اٹھنا اس کی بھوری تھی۔

”میرہ صاحب نے کہا ہے کہ انجینی کی طرف سے شمع کا ایک ۵۵۵۳۷۸۸۷ ۲۴ فرزٹ انڈیا میں دی جائے؟“

شمع نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمال نے کاغذ پر نظر ڈالا۔

شمع، جمال

تاریخ پیدائش: ۸ مارچ ۱۹۶۵ء

تاریخ وفات: ۱۰ جون ۱۹۹۷ء

جمال کی نگاہ تاریخ وفات پر آکر ٹھہر گئی۔ وہ آج شمل دار ہے۔ شمع کی میت کا دن! شمع نے اسے بتلایا تھا کہ ہر شمل دار کو کنش جی کا برت ملے گا جب سے شمع شمع لالہ سے تپ سے رکھ رہی ہوں۔ کبھی ناخبر نہیں کیا۔ اس نے بڑے غم سے کہا تھا شمع کی آزاد کی بازگشت دیر نہ ہو جمال کی سہاقت میں جاری

اس کا نہ بچتا رہا۔ پھر شیخ کے بے جان چہرے پر ایک نظر ڈال رہے
چہتے ہوئے وہ بھی چلی گئی۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے دار اور
شنا سنا اپنی خطیوں نکال کر ان کی سداوت کو کر کے میں جوڑ کر پہلے
گئے۔ کر کے میں اب مرت اگر تیروں کا دھواں اذیت ناک خاموشی
کے ساتھ پٹ کر گویا کر رہا تھا۔

منزل کی دستک پر دروازہ کھلا سنے شیخ کے بابا کو کھڑے
تھے۔ ان کے پیچھے آئی نہ سیدہ تو دیکھ کر ایسے مڑی تھیں جیسے زمین پر
گی سبجے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں انہیں جہاں کو شام کی
نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیل کا ایک چوڑا سی کلسی جس کے
منہ پر سوخا پتھر بندھا تھا۔ بابا کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں
آپ کی بیٹی کو کوٹھنا ہوں؟

بابا نے کلسی کی طرف لپکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آئی دوڑیں
ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر چوٹ چوٹ کر رہیں۔ اور جال کی آنکھوں
میں غرا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بھی بہہ نکلا۔

◆ بقیرہ صفحہ ۲۰۱ ایشیکو کی ہیئت کا مسئلہ ◆
کے ساتھ کامیاب ڈائیوٹیکھے ہیں۔ اور راقم الحروف کو ٹیکھے گئے خطوط
میں اس تبدیلی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ڈائیوٹیکے ایک اہم شاعر
و نقاد محمد امین نے بھی ذاتی ملاقات میں ڈائیوٹیکے کی ہیئت کے بارے
میں مندرجہ بالا موقف کی تائید کی ہے۔

یہ ایک سٹے شدہ اسے کہ ہر صنفِ سخن کی پہچان اس کی ہیئت
ہی ہو تو ہے جس طرح ہم ہر چار صنف کے نظم کو راعی نہیں کہہ سکتے۔
بالکل اسی طرح ہر سخن صنف کے نظم کو ڈائیوٹیکے نہیں کہا جاسکتا۔

◆ بقیرہ صفحہ ۲۰۳ — حرمانست ◆

کے پاس ہے۔ دن کا رہی سہی۔ عمو اور لوہن کی خوشبو نفاذیں
میں بکھر رہی تھی۔ "اے۔۔۔ اے دروہ کیسے تیرے خنے کا دروازہ پھر
کھل رہا تھا۔"

توسیلہ ذکا پتہ:

Shair Monthly
400 004

رہی۔

"جمال میاں آپ نے بتایا نہیں تھیں کہ بوجھ: ابو جی نے دوبارہ
اسے یاد دلایا۔ جمال نے ہم آنکھوں سے شیخ کی لاش کی طرف دیکھا۔
سر ہانے اگر تیرا رنگ وہی نہیں۔ دھوئیں کی نیلی غامضی گھیر کر نقاسی پھیر
وجہ سے رنگ رہی تھیں۔ آتھن لادریابی غلامت کر رہی تھیں۔
در شیخ کو قبرستان نہیں شش سالہ جانا ہے۔"

"ہیں!! جمال کے اس جواب پر ابو کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ چند
ثانیوں تک وہ بیٹھے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ جو فرط جذبات سے لرز
رہا تھا۔ پھر انہوں نے شیخ کی لاش کو غور سے دیکھا اور شخصیت لرزتی
ہوئی آواز میں پوچھا کہ: میں نے اپنی خواہش مٹی۔"

"نہیں۔ اس کے اور میوے درمیان اس کو ضرور پرکھی بات
نہیں ہوئی۔ اور پھر اتنی جلدی کہ سب کچھ بولنے لگا کہ میں نے بھی سوچا
تک نہ تھا۔"

"دیکھو میاں وہ مسلمان ہو چکی تھی اس نے کمر پڑھا تھا۔۔۔ ابو
داعی کو بھیج کر سخت لیکن دینی آواز نہ دے اس نے میرے مذہب
سے متاثر ہو کر اپنا مذہب نہیں بدلتا تھا۔ مجھے حاصل کرنے کے لئے اس
نے مذہب تبدیل کرنے کی رسم ان کی تھی؟"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ لڑکی آواز غصے سے بلند ہو گئی کہ
اے راجہ جہاں میں موجود تمام لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے
لگے۔

"میں کہہ چکا ہوں جو مجھے کہنا ہے۔ میں اس کی آتما کو سکون
پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"دیکھا جلتے سے اس کی آتما کو سکون مل جائے گا۔ ان کا
بھو اتھاری اتھاری تیز اور تیز تھا اسی اور اسی کام میں درمل پر بند
کر کے باہر بیٹھے کے قریب پہنچا آئیں۔

"اے خدا! سوچے شیخ نے میرے لئے مذہب بدل دیا تو میں
اس کی آتما کو سکون پہنچانے کے لئے ناجائز بھی نہیں کر سکتا۔"

ای اور باجی نے اسے خدا کا واسطہ دے دے کہ سہلانے کے
بہت کوشش کی۔ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔ "شیخ کی آتما کو راہ
سنا کر سے ہی سکون ملے گا۔"

ابو زیا وہ دیر برداشت نہ کر سکے اور اسی کا ہاتھ پڑا کر کہنے
اپنے زیریں سے دھم دھم کرتے ہوئے اڑنے لگے باجی کچھ ٹوٹنگ



ساجد حمید

جنگنوں کو گھپ اندھیروں میں اچھال
زندگی بن جائے گی ورنہ وصال

جائے نی لے یا ملاوے خاک میں
میں تری آنکھوں میں ہوں شبنم شال

بمخدا احاسن کو سیال کمر
ورنہ دھندلا جائے گا روئے خیال

کیا فرود ہی رہے گی شاخِ دل
کیا گزر جائے گی یونہی ماہ و سال

اس کی چپ بچہ کو پیشیاں کر گئی
گو بہت آسان تھا مسیحا حوال

چاند اترے گا ہماری چھت پر جب
ہم بھی کھلاش گئے ستارہ باگسال

● سوانی پٹیا، شملہ ۱۹۷۰ء کرناٹک



ارمان فجی

اکیسے حوصلے کا ماحب لکھا ہوا ہے
بلند ہی پرکشی کا نقش پانکھا ہوا ہے

ہر میت خود دکان کو جس نے صف آرا کیا تھا
ہر اک رخ پر وہ سحر بے صدا لکھا ہوا ہے

طلسم نور سے معور ہو جاتی ہیں آنکھیں
درد دیوار میں کیا معجزہ لکھا ہوا ہے

نکالی اس نے کیسی راہ جس کے بیچ و خم تک
دیار خود شناسی کا پستہ لکھتا ہوا ہے

تمہاری دسریں میں کیا ہے خود ہی دیکھ لو گے
گندے وقت کا جو فیصلہ لکھتا ہوا ہے

دھند ٹکوں کا نوشتہ سائے کیا پڑھ لے ہو
پس دیوارِ حریف آئینہ لکھتا ہوا ہے

ہوا سے برسرِ پیکار وہ کوسا نس لینا
جراغِ رنگند کا مرتبہ لکھتا ہوا ہے

● پوسٹ بکس ۶۲۴-۱۲۲ (سعودی عرب)



عبد الحمید

بستے ہیں مہربانیں تو کیسے ہوگا
اور سلامت گھر جائیں تو کیسے ہوگا

نیش زین دل - وہ تولیے اندر ہے
چھوڑ کے گھر باہر جائیں تو کیسے ہوگا

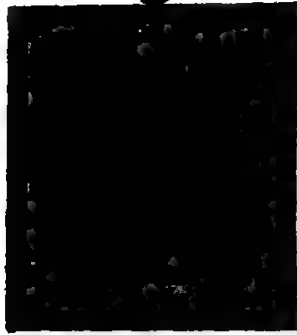
جن کے قریب آنے سے دل ڈرتا ہے
دوہری دور گزرتی ہیں تو کیسے ہوگا

سارا دھیان اسی جانب کیوں رہتا ہے
آنکھ سے یہ منظر حب میں تو کیسے ہوگا

جیت بھی لیں ساری دنیا تو کیسے ہوگا
ادب باندی ہر حب میں تو کیسے ہوگا

ہیں سمندر دور سے کھینچتا رہتا ہے
کبھی جو ساحل پر حب میں تو کیسے ہوگا

● منجہ اردو، گورنمنٹ رضا پٹی کالج - ماہد



سیرجہاں

1721 HILL STREET SUITE 111
SANTA MONICA, CA 90405 USA

سیا مینز ٹونس

تھے۔ گہرے یہ گھر بڑے ہی خفیہ انداز میں عزیمت اٹھا دیے تھے۔
خاموش طبیعت انسان تھا اس کے والد پاکستان میں امپورٹ
ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ اور حبیب کے والد کسٹمر کلائر تھے۔
دونوں بچوں کا رشتہ حدود بچوں کے لئے مناسب تھا۔ انہیں یعنی
والدین کے بڑھن کی بقا کا خاص من ضرور تھا۔ لہذا انہیں علی چوں ہی
امریکہ چھینوں میں گھر آیا حبیب سے اس کی شادی کر دی گئی۔ کسی
پسندیدہ ہنسند اقرار یا انکار کی کوئی گھٹائش ہی نہیں رکھی تھی
رہی حبیب تو اتنے اگلے سے ٹاک صرف اتنا تھا۔ بیٹے چاہوں کہ
آنکھوں کے اندر تک ہی رہنے دو۔ اور حبیب سمجھ گئی تھی کہ اگر کسی
خواب آنکھوں کی بیڑیوں سے اتر کر دل تک پہنچ جائے تو پھر
ہر دم و کھن میں سما جاتے ہیں۔ اور زندگی جیسے ہر وقت ایک ملک
کرتے ہوئے ہیں۔ ہرے سانس میں گزرتے گھٹتے ہیں۔ کیا جانے کب کہاں کی
جگہ پر ہم پھٹ پڑے اور معافیت کا گوشہ گھٹتے کہ دل سے پھر بھی
ایک حقیقت تھی کہ منظور احمد نے کالج میں سوائے ہنسی مذاق
کرتے کے کسی خوبصورت خواب، کسی ہکا شاک، کسی توس ترزع
کی طرف ہجرتوں میں اشارہ نہیں کیا تھا۔ نسبت کو تو یادوں میں تو
بیک درد مر دک کی طرح چلا یا جاسکتا ہے۔ مگر علی زندگی میں نہیں
حبیب نے خود سے اپنی اماں خالہ اور اپیا کی طرف دیکھا۔
مہر چہرے پر ایک ہی کہانی لکھی تھی۔ خالہ کی ویران آنکھیں، اتنی
لمباؤں سے گھاسے بے نیاز تہہ تراؤں اور اپیا کی زرد پھولوں
جس لانس سکراہٹ۔ چلو اچھا ہوا حبیب سے بھی نام نہاں سے بچنے
کا راستہ دھونڈ لیا۔ اور آنکھوں سے دل تک جانے دے لے لے لے
پر کہیں کسی کانٹے سے دم بھرتے نہیں دیا۔ اور یوں اس کی شادی
ہو گئی۔ حبیب کو شادی کے بعد ہی نہیں چلا کہ سمندر میں کپاڑ

غیر علی کی وفات کے چھ ماہ بعد بھی حبیب اس کے ذکر پر مارا برٹین
بھرت بھرت کر دیتے تھے۔ تو حبیب علی کے ذہن میں پہل مرتبہ چھٹکاڑ
اوتے سانپ کی طرح ایک خیال نے سراٹھایا۔
آج بھی روز کی طرح شام ہی سے مارا اس کے پاس آگئی۔
تھی اور دونوں اپنے اپنے بچوں کو کھاتے پاتے اور سالانہ کے بعد
غیر علی کا ذکر کرتے ہوئے 'ادب میں' دکھ اور غم کی صورت پر
باتیں کر رہی تھیں۔ یہ بہت اچھی اور انوکھی بات تھی کہ ساڈا کراس
کے پاکستانی بوائے فرینڈ نے انگریزی ادب سے بہت اچھی طرح
روشناس کر دیا تھا۔ اور وہ اس وقت بھی جلتے جلتے دھات
میں رک کر حبیب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے SHELLEY
کو دہراتے ہوئے کہا:

WE LOOK BEFORE AND AFTER

AND PINE FOR WHAT IS NOT

یہ کہہ کر اس نے غیر علی کے نام کی فنی ہر اقد پیرتے ہوئے کہا۔

I WISH THERE WOULD BE A

DEVICE TO ERASE MEMORIES

تب پھر سانپ نے سراٹھایا۔ اور چھٹکاڑ ماری اور حبیب نے دل کو پکڑا
ہوئے دہرایا۔ ان آؤٹ سٹان بخت خسروا

حبیب کا زرد و اترا ہوا چہرہ، رنگوں کی گراہ سرخ آنکھیں آواز
میں سچے ہوئے آنسو اور پورے وجود پر کرب کی ہر اپنے شوہر سے
اس کی بے پناہ محبت کی گراہی دیتی تھیں۔ مارا اس کی پڑوسن اور
ہترین سبلی تھی۔ دراصل یہ DUPLEX ان لوگوں نے مارا
اکا سے لیا تھا۔ سیا مینز ٹونس کی طرح یہ دونوں گھر نشین کا شوگر
رہاڑے جڑے ہوئے تھے۔ لیکن فرشتہ مالک فاختہ رختوں پر

کہنے کو سندھ کب جیب سے باہر نکلا، کب شلوٹنگ بگ جینز اندر بی چلا
 کہ چوڑے چوڑے ہالٹے لے لے، نیارنگلہ شام کے قریب اس چوڑے
 سی بستی میں رہتے ہوئے جیب اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھی۔ سچ
 بات یہ ہے کہ جب انسان اندر سے کھوتوں کے لئے تیار ہو تو باہر کی
 زندگی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ بڑے دلوں میں جب ایک دن غیر
 کہہ سکتے ہوں باتوں، وہی میں جیب کو بتایا کہ "بھیا کو تو بڑی چچی
 وہاں چاہیے تھا۔" تو جیب کے کھوتوں نے بڑے تڑا کے ساتھ ساتھ کہہ
 دیا تھا۔ اس کا دل اپنی سائز کی رنگت پر بہت دکھا تھا۔ اور وہ اس
 وقت تک گورے پھسکنے کے لئے آزمائشیں کر رہا تھا جب تک روشن پیدا
 نہیں ہو گیا۔ پھر وہ دن رات جیسے خالی مری دے پر دوڑتی ہوئی کاروں
 کی طرح گزرنے لگے۔ روشن کے پہلی دوسری تیسری سالگرہیں آن چکی تھیں
 کہ انہیں جیب کو یہ احساس ہو کہ اس کا شوہر کچھ بدل سالیگا۔ اب
 وہ اکثر دیر سے گھر آتا اور اس کے بعد بھی کسی گھر کی سوچ میں ڈوبا ڈوبا
 سا لگتا۔ عموماً ایک اینڈ نہ پر بھی کالے کھٹے میں باہر چلا جاتا۔ اسی وہ
 حالات کا جائزہ لے رہی تھی کہ ایک شام وہ جلدی گھر آ گیا۔ اور بولا
 "جلد سے تیار ہو جاؤ ایک جگہ جانا ہے۔"

"کیا۔" کہنے کے گھر کا قریب ہے۔ وہ بار بار جیتا میں سے پوچھتی رہی۔ عظیم
 چہرے پر بھی مسکراہٹ سے معاملہ کو ادھی پر سوار بنا دیا۔ یہاں تک کہ
 جیب اسکاٹلے سے انہوں نے نیارنگلہ فالنگ ۲۰۰۳ لی تو جیب
 بے ساختہ ٹھٹھکا کر آہیں پڑی۔

"یہ نیارنگلہ فالنگ ہے اتنی خطیبات ہو گئی: ان کا پائٹ فالنگ
 سے بہت ذلیلہ دیدہ بھی نہیں تھا۔ یہ پورا شہر ہی بہت چھوٹا سا تھا۔
 غریب نے خابوٹھی سے کار کو دوچار سڑکوں پر گھمکنے کے بعد ایک
 گھر کے کچے روک دیا۔ اور گھنٹن بھائی۔ ایک دھلا قد خاص خوش شکل لڑکی
 لڑکھنے اور دواڑ کھولا اور بڑی خوش دلی سے بولی۔
 "اے عالیہ"

"س برٹن یہ میری چری۔" بانی۔ اور بیٹا دوش ہے۔ یہ میر جیب
 سے بولا۔

"بانی۔ یہ بس برٹن ہیں اور یہ ان کی بیٹی مریم"
 گوری سی بڑی بڑی کالی آنکھوں والا کالے کالے بالوں والی چوڑے
 پلٹے سر لڑکی ان کے اسکتے سے کچھ چھتے ہوئے آواز میں
 کہا۔

چار سال پہلے جیب میری لڑکی کوئی تھوڑے کھانیر
 شاد کلاں پہنے ہوئے تھا تو اس پر بھی گر پڑی تو اب اس کی کمر میں
 آٹھ کھانیریں صحت کی زندگی میں مرد کار کے SPARE TYRE
 کی حیثیت رکھنے لگیں۔ تب ہی تو اس ملک میں شناخت کے لئے
 ہر نام پر عمرتوں کا نام ضروری ہوتا ہے۔ اِنَ الْاِنْسَانِ فِیْ خُسْرٍ
 جیب ابھی اپنی آمد کا مقصد بھی نہیں سمجھتی تھی کہ غریب نے سارا
 ہاتھ سے چالائی اور اسے اشارے سے اپنے ساتھ لے کر لے کر لے کر
 مرد دوسری طرف پہنچا۔ دوسری طرف بھی بالکل اسی گھر کی طرح ایک گھر تھا۔ اس
 نے تالا کھولا۔ اور انتہائی ڈرامائی انداز میں دونوں انہوں کو جوڑ کر چلیا
 کہ کھتری پر چال دیکھتے ہوئے بولا۔ مہارک ہو لینڈ ریڈی بنا۔

جیب کے خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ شرفی صحت کی زندگی کی
 سب سے بڑی خواہش اس کا پانا گھر ہوتا ہے۔ کسی قبریں پاؤں لگانے
 ہونے بڑھ چلتے تھے اس کی خواہش پوچھتے تو وہ گھر کو رائٹس کرے گا اور
 جیب تو صرف جوان تھی۔ بلکہ ایک ایسے بچے کی ماں بھی تھی جس کے لئے
 اب ایک بیڑم کے اپارٹمنٹ میں ٹرانسکل چلانا نا ممکن ہو گیا تھا۔

لگے چھ آٹھ گھر کو سوار لے اور پڑوس سے دوستی برٹھانے
 میں گزرنے لگے۔ نئے گھر میں آئے کے بعد سب سے بڑا نالہ ہوا وہ یہ تھا
 کہ اب غریب جلدی گھر آجائے اور سوائے ایک اینڈ کے تقریباً تمام دقت
 گھر پر گذارتا۔ گریباں چلی گئیں۔ چائے کنگے۔ قیامت کی برت باری
 میں جیب دروازے کھڑکیاں بند کئے شوہر کے لئے سو ستر بنی تھی
 اور سوچتی رہتی کہ اللہ کتنا مہربان ہے۔

برٹن کی سارا برٹن سے اس کی بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی وہ
 بھی روز کام پر جلتے ہوئے اپنی بیٹی مریم کو جیب کے پاس چھوڑ دیتی
 دوڑنے پھرتے ہوئے جیب کو بھی مریم سے بہت محبت ہو گئی تھی۔
 دوڑنے پھرتے آدھی انگریزی، آدھی اردو میں باتیں کرتے جیب جہاں
 بھی جاتی دوڑنے کو ساتھ لے جاتی۔ بار بار ایسا ہوا کہ لوگ روک کر پوچھتے

ARE THEY TWO ARE اور جیب آہیں پڑتی۔ وہ کبر دقت خوش رہنے لگی
 تھی۔ سوائے ان ایک اینڈ کے جب غریب کو باہر جانا پڑتا تب وہ بہت
 دکھی ہو جاتی ایسے میں اکثر سارا بھی لپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی۔
 تو تنہائی بہت بڑھ جاتی۔ مگر کچھ بات تو ہے کہ اگر تنہائی انسان کے
 اندر گہر نہ بنائے تو باہر کی تنہائی سے بیٹا شکل نہیں ہوتا۔ سو اس
 سے بچتے بیٹے وہ دھیر دھیر سو ستر بن لیتے تھے کبھی جیب وہ غریب کے بلے

زحیٰ پرانگی تھی۔ اور وہ ہر اینٹ کے نیچے ایک ایک سیب چن کر نکال رہی تھی۔ حبیبہ کو پہلی مرتبہ اس پاکستانی لڑکے کو برا بھلا کہنے پر انوس ہند ا تھا۔ یوں بھی مرنے والوں کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔ اس نے کوٹ بدل 'رات کے دو بجتے' صبح تک انتظار مشکل تھا اس نے سارا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جوں ہی سار لے دروازہ کھولا ایک چٹخی کے ساتھ حبیبہ اس سے پٹ مٹی اور پچھیلوں کے درمیان بولی :

WE SHARED PLEASURE TOGETHER NOW
WE ARE PARTNERS IN GRIEF.

آج دونوں گھر صبح سنوئوں میں سپائیز ڈانس ہو گئے تھے۔
بقیہ مکتوبات صفحہ ۴۸۔

★ سہیل سنگھ صاحبہ ۱۹۸۸ء مئی ۱۲ تاریخ
مولیٰ محل قوی

خاطر کے دونوں جڑ خدوے ۲۲ موصول ہوئے۔ خاطر یوں تو حرم اچھڑتی کے نکلنے میں بھی ہندستان کا اتل نمبر لاہور سے تھا لیکن جہیز میں صاف جھٹ کے بل جڑ جس طرح آپ نے اس جہیز کو روشن رکھا ہے وہ آپ ہی صاحبہ۔ مٹی جگہ جیتنے ۴۴ لوگوں کے لئے آپ ۲ دم نیست ہے۔

★ چلو یہ اقبل — صرف میں نہ ایک برس ہمارا زمانہ
پوشہ مٹی ۲۲

خاطر کے مدح ابد مل اور مٹی کے خدووں کے سر رونے سے جہیز آئے۔ اردو کے بعض ادیبی رسائل کے بل جھٹ کے سر رونے کے جگہ کوٹ ہوتی ہے وہ خاطر کے سر رونے کے جگہ کوٹ ہوتی ہے۔ لاہور و سائل کی زبانی ہے، لاہور و سائل لاہور سے استعمال، جس کا سلیو مٹی میں لاہور سے آیا ہے۔ ابد مل اور مٹی کے خدووں کے مشورہ کے بدلے میں آپ کو فائدہ کھاتے کرنے دے سکتی، مگر خاطر کو قندہ لاہور کا مٹی کی مشامت کے ۲

خط و کتابت کا نیا پتہ

'Shair' Monthly
P.O Box No. 3770
Girgaon H.P.O.
Bombay 400 004

دیشی تو سار کے لیکے ہن کا خیال آجاتا۔ اور وہ کہتی "خیر یاد رکھو یہ دونوں گھر بالکل ایک جیسے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں آپ جیسا شریف شخص ہے اور سار کے گھر میں وہ کیڑا انسان اپنی ذمے داریوں سے بچا چھڑا کر بھاگ گیا ہے۔" حبیبہ کو اکثر اس پاکستانی لڑکے پر غصہ آتا جو سار کے دل کی گتے کرتے کرتے ایک مددگار کا قندہ دے کر وطن چلا گیا۔ کبھی بھی وہ بھلا کر کہتی یہ ان بھنٹوں کو خدا کا خوف بھی نہیں۔ کیا ان کی اپنی ماں نہیں نہیں ہوتی یہ بھی وہ سوچتی نہیں ہے کہ گ۔ اڈیر پنچا لڈیا لڈیا گھارے پتی تم سار کے نکاح کرو۔ اسلام میں تو چار شاواہاں جائز ہیں کم از کم ایک ہنگی کو باپ اور ایک عورت کو سار کے میں عزت تو مل چاہیے گی۔ مگر دوسرے ملے خود بخود اپنی سوچ کی نفی کر دیتی عورت نسبت میں شرکت بھی برداشت نہیں کر سکتی اسے پورا مرد چاہیے۔ عجیب بات یہ تھی کہ حبیبہ کو اس سب سے وفار کے پریشہ فتنہ آتا، وہ کہتی سار بچے اس کا پتہ دو۔ میں پاکستان چاہے اس کو ذلیل کر دوں گی۔ سارا اس کی اس کی طرنداری کرتی اور کہتی باجی تم نہیں جانتی کہ سار کے کچھ مجبور رہی ہو گی۔ ورنہ گھر ٹاپے دنا نہیں ہے۔ اور اصرار پر بھی سار کے نہ تو کچھ اس لڑکے کا نام بتایا اور نہ ہی پتہ دیا۔

کبھی کبھی جب حبیبہ تنہا ہوتی، سارا اپنے ماں باپ کے گھر وہ 'بیر کا کے سلسلے میں' ہر گنا ہوتا۔ تو اسے سارا کا گھر اور ساتھی اپنا گھر، حبیبہ اس سب سے زہ سے لگنے لگنے کے خدووں سے چلنے کی آہیں، دہلی دہلی سی ہنسی رات گئے برتنوں کے بجنے اور ٹکے کھلنے بند ہونے کی آواز میں جب آہیں تو حبیبہ ہم کر آیت اکرسی پڑھتی۔ چاروں تل پڑھ کر حصار باندھتی یا موٹیا مولاد کہتی ہوئی روشن کو سینے سے چسوائی۔ کبھی کبھی جب دن میں بھی یہ آواز سے آہیں تو وہ ہر آہٹ کو اپنا جیم سمجھتی۔ اور 'بیر کی واپسی پر اس سے اپنے خوف کا اظہار کرتی تو وہ ہنس کر خات اڈانے لگتا۔ سو یہ دونوں گھر ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی ایک جیسے نہیں تھے۔ مگر جس دن 'بیر علی کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوا اس دن یہ دونوں گھر ایک جیسے ہو گئے۔ سارا اور ذرا نہ کام کے بعد حبیبہ کے پاس آجاتی اور دونوں گھنٹوں بیٹھے 'بیر علی کو یاد کرتی۔ حبیبہ ایک دیگر فتنہ بوی کی طرح اور سارا اب بوی کے سب سے غمناک کی طرح مگر آج سار کے جلنے کے بعد جب سب سے بڑی نواک ایک کر کے سارے پردے اس کی آنکھ سے اٹھتے چلے گئے۔ اعتماد کی پوری عمارت اڈا اڈا دم کرتی ہوئی



اکرم کمال

یوں حسن التفات سے کراؤ نہ مجھے
اعجازِ کُن سے بخش دے ارضِ مہمانی

اک قفلِ سرزنش نے مرے ہونٹ کی دے
ورنہ جنوں تھا خوشیِ نقار کا مجھے

اے عشقِ تیرے باغ کا موسم ہے انتظار
اور اضطرابِ شوقِ نمویا نہ مجھے

دش تارث کو محفوظ کر سکوں :-
ظلمات میں ہے ایک یہی مشغلہ مجھے

اک مشعلِ مرغ کی حسرتِ ناکامیابی نے
اک آرزوئے خاک شدہ کر دیا مجھے

اک گہرے انتشار کے گرد اپنے کمال
ہر سمت سے غروب کا منظر کیا مجھے
● ۳۹۔ بالمقابل اشقندیکری جوہرین
اندھیری بیٹھ ۵۸

اصغر رضوی

نغمے خاموش ہیں الفاظ کے گھر خاموش
ظائرِ فکر ہے سہا ہوا پر میں خاموش

باتھ اٹھتے ہیں مرے شام و سحر سچے نکلا
نیا دے عالجیے شب بابِ اثر میں خاموش

ہے اداسی کا سفر شعر کی دنیا میں عجیب
کچھ تو ہے بات کہ شعروں کے نگہ میں خاموش

اب بھی نظامِ ہر ملک کمرے میں بکھرے لیکن
جانے کیا بات ہے کیوں ابلی نظر میں خاموش

گو خیتے تھے جو ہر اک صحتِ فضا میں اصغر
اب اپنی لفظوں کی جھنکار کے در میں خاموش

● لی ۱۳۸۔ بگالی بانا، میا بربہ، کلکتہ۔ ۲۴



بلراج کمار

عجیب سلسلوں میں ہم نے زندگی تباہ کی
لو اب کی ہیں تمنیاں نہ لڑتیں گناہ کی

نہ پاؤں میں زمین ہے نہ سر پہ آسمان ہے
کہاں پہ ڈھونڈتا پھروں کوئی جگہ پناہ کی

کوئی تو ٹھہرے رات بھر ہمیشہ اس طرح نہ ہو
کہ شام ہو گئی تو سب نے اپنی اپنی راہ لی

نہیے تو میں بھی نہیں پڑوں چپے تو ہیں ہیں
نکھڑے گشت میں میرے لئے مصعوب ہیں بیاہ کی

کہاں غروب ہونے دیں دکھوں کا آفتاب کو
یہ دل کی حکمرانیاں یہ سلطنتِ نگاہ کی

ندامتوں کے زرد در و چراغ جھللا اٹھے
ہزار داغ دے گئی تلاش گاہ گاہ کی

● اورش نگر، مارڈ نمبر ۲، نزد عید گاہ، ادم پور - (کنیر)



نور الحسنین

آئی انٹریڈیو، اودنگ آباد، ۵-۵-۴۳۱ (مہاراشٹر)

حراست

پھر ایک بار دوسری رات تھی، وہی بے چینیاں، بے چینیاں میں عجیب سی آئین، ناک بند، اور رکتی ہوئی سانسیں۔ اس کے کانوں میں عجیب غریب آوازوں کا شور تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی تھی۔ وہ باتویر دھنکے گا اس نے پوری شدت کے ساتھ بازو دھکی ہوئی پوری کواڈنسی دین لیکن وہ کس کس نہ ہوئی، شاید آواز اس کی حلق سے نکلی ہی نہ تھی۔ وہ دھ سے بھی سانس لینے کا محاذ کر بیٹھنے کی اس میں سکت نہیں تھی تب ہی اس کے کانوں نے سنا۔

”جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔“

”ہاں! ہوئی کو کون ٹال سکتا ہے۔“

اس کے اطراف حافی پہچانی آوازوں کا شور تھا لیکن وہ پھر بھی کس کو پہچان نہ سکا۔ یہ آوازیں تو اس کے قتل آشوروں میں کہیں کوئی تھیں یہ سب پٹ کر کیسے آگئیں۔؟ دور کہیں دھ اور تاشوں کا شور تھا، جیسے نواشاہ پہنچنے ہی والا ہو۔ کسی عجیب سی جیل پہل تھی۔ اور وہ ماہی سے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

”بس کچھ ہی دیر کی بات وہ گئی ہے۔“

”ہاں! پھر وہ ہم میں بیچو جائے گا۔“

”کہا دے کس کو۔۔۔ بس اب سفر شروع ہونے ہی کہے۔“

پتہ نہیں وہ کب تک اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔ اور بند آنکھوں میں منظر رونے لگا۔ سپاہی دھڑکے تھے مائرن ٹکا رہے تھے۔ سیٹیاں چونکی جاتی تھیں ایک ہتھ مار تھا ابھی وہ کچھ کچھ ہی نہیں پایا تھا کہ جھگٹے قدم اس کے زور و تھیم سے جھک گئے۔

”سر! وہ نکل بھاگے ہیں کامیاب ہو گیا ہے۔“

”اتنے سخت انتظامات کے باوجود یہ؟“ وہ اچھل کر کمر

بگایا۔ اندر پھر سپاہیوں پر برس پڑا۔ ”ٹھونڈا سے، ابھی وہ اسکا

عمارت سے بہت دور نہیں گیا ہو گا۔“

سپاہی پھر دوڑنے لگے۔ سائرن اسی طرح بجنے لگے۔ اور وقفے وقفے سے سیٹیاں جو تھیں رہیں۔ اسے چلنے کے لئے سارے ہی سائینڈک انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ ہر جگہ ناکہ بندی ہو چکی تھی اس کا اب یہاں گزار ہونا ممکن ہی محسوس ہو رہا تھا۔ سڑکوں پر پولیس کی گاڑیاں ایسے دوڑ رہی تھیں جیسے شیر پاؤں میں حلق دوڑا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اب بھی قابو سے باہر تھا۔

اُس نے ذوق کو کر ٹیلہ لہرا دیا۔ اندر پھر کرسی کی پشت پر بھول گیا۔ اس کی ڈیوٹی میں آج تک جیل کی چار دیواری کو بھٹانا تک کر بھاگنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی تھی۔ وہ اس قدر سخت مزاج تھا کہ بڑے سے بڑا گمراہ اس کی جیل میں پناہیں مانگتا تھا لیکن آج یہ کیسے ہو گیا۔؟ وہ سوچنے لگا آخر وہ اس جیل میں کب آیا تھا؟

”اپنی مرضی سے کون آتا ہے۔ اور ہر بار پکا۔“ ہتھکڑیوں میں بچڑا ہوا وہ اس کی آنکھوں میں بھر آیا۔ ”ہاں جی!“ کا خون بھی تھا، اس سپاہی بھی تھا اسے اور تھلے سے ہی دھڑکاتی رکھنے کے لئے ہم لوگوں کو بار بار جہنم لینا پڑتا ہے! اسے ہم نہ ہوں تو اس دزدی کی آبرو ہی کیا ہے۔؟“ گناہوں پر پردہ ڈالنے سے پار سائی نہیں مل جاتی۔ جو ہنہ۔۔۔ تھا اسے لئے بے شمار مکتب تھے۔ لیکن تھلے ان میں پڑے کر بھی کوئی بہت حاصل نہیں کیا۔ منزل کے سراب نے تھیں سیدھی راہ تھیں کا کر چھوڑ دیوں۔ پر ڈال دیا۔ اے یہ دزدی کی آبرو وہی ہے جو تھیں اب بھی پوری طرح گم ہونے سے پہلے ہی دھونڈ کر آئی ہے۔!“

اسکے چہرہ مزہر طنز۔ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنے بندے ہوئے اتھروں کی طرف دیکھا۔ اور پھر کہیں غلاؤں میں کھو گیا لیکن نڈز اس کے جسم سے آ رہی تھی۔ پیچھے کے پنکھ تو بہتے ہیں۔ لیکن دانے کی

مزدت اسے اندھا کر دیتی ہے۔ لہٰذا اسے قانون نے جب لگا دیکھا تو پہلی کوجال میں پھر پھر مرنے لگا دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں کو اندھا ہونے سے پہلے کسی نہیں دیکھا۔

”یاں تھاری آنکھوں کا علاج اس طرح ہو گا۔ کہ پھر کچھ دانے دیکھ کر تھاری بینائی نصیب نہ ہو سکے گی۔“

”وہ کھلا کر جس پٹا۔ پیاری آنکھوں کی نہیں ہے۔ یا پوجی سونہ تو پیٹ کا بزنس ہے۔“

”دشت اپ!“ وہ قید ہی پر برس پڑا۔ ”میری ہی قید میں آکر مجھے ہی زباں دراز کی کرتے ہو! میں تم لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری ہر والی ہیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہوتا ہے۔ تم اگر کبھی یاد کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارے کیا کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن تم ہی ناشکری ہو۔ دانہ دھونڈنے کا مطلب تم نے خود اپنے آپ کو مسئلہ کیا ہے۔ دانہ دانہ تو گھر بیٹھے تم تک پہنچا رہا تھا۔“

”تو پھر اس بدن میں حالت اور مزاج میں حرکت پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کھرا کرتے پھر پودوں کی طرح۔“ وہ پھر ایک بار اندھ کر مڑا ہوا تھا۔ ”باوجود یہ بات تمہاری جہد میں نہیں آتی گی۔ اگر ایسی ہی بات، موت تو جنت کے سارے میوؤں کو چھوڑ کر آ کر گندم کی تہی نہ جاتی۔“

”اُس نے پٹ کر اس کی طرف دیکھا اور عین ٹھیک تھا کہ اس کی ضروریات اس کے گناہوں کے مقابل موت حاصل کر رہی، اس نے ہتھیار کسب پاہوں کو حکم دیا کہ اسے کوٹری میں نافذ کر دو۔ اور ہر فرد کو سخت کر دو۔“

وہ سناٹوں پر اپنا ہر چوڑنے لگا۔

اس نے پھر ایک ہی سانس لی۔ اور آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ اپنے آپ کو جبہ حدِ مکرور محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب دُھند چمٹ چکی تھی۔ بلب روشن تھا۔ اس نے اپنی ناک دبا کر دیکھا۔ وہ سمر کے مطابق سانس لے رہا تھا۔ اس کے بازو میں اب بھی اس کی بیوی ایسی طرح سمیٹ رہی تھی۔ تھکے تھکے پینے ڈاکٹر۔ بورت منہ چرمھا۔ ہی تھی۔ کہ سب کچھ اڑ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ چیل گئی۔

”ہر قیدی کو ہر حال ایک دن آزاد ہونا ہوتا ہے۔“

”آزادی ملا دے کچھ نہیں ہوتی یا پوجی، کوئی ایک قید سے

مکلف ہے۔ قعدری قید میں آگ جتنا کچھ دھوتے دھوتے اور کبھی خوشی خوشی۔ میں جب پیدا ہوا تھا تو میرا دلپ خوش ہو رہا تھا کہ میں دنیا میں آگیا ہوں۔ اور میں شاید اس وقت اس لئے مدد کا حکم میرا مرت پڑنا نہ ہوتا تھا۔“

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ سچائی کو دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی قید ہی میں تو ہیں۔ لیکن گمان ایک دوسرے کو یہی ہے کہ وہ جیل ہے! چونکہ گناہیں اگنی ہے یا سراب، یہ تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور آدمی امت کے دھوکے میں کیسے کیسے دھوکے کرتا ہے۔ اور پھر اپنے ہی دھوکوں پر شرمناک نام ساجو کر ساری زندگی چوروں کی طرح بسر کر تیل ہے۔ اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ تو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی چیل میں آئے والے ہر مرم سے زیادہ گناہ گار۔ تو وہ خود ہے وہ شاید قید کی سب سے طویل سزا کا شہر ہے۔ اس نے کتنے ہی قیدیوں کو اپنے ہاتھوں سے لائی دوائی لیکن اپنی ہی جیل سے خود کبھی باہر نہ نکل سکا۔

”تم ابھی تک جاگ رہے ہو! ہمیں تو آرام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیشہ سے سونے والی رہو۔ اب بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے شاید اس کی طرف دیکھا تھا۔ شاہ جو اب بھی دیا تھا لیکن اس کی آواز غلط سے باہری نہیں نکلی تھی۔ اس کے اطراف پھری شروع تھا۔ اس کی بیوی سرور ہی تھی۔ اور وہ پتنگ پر ہاتھ پیر کھینچ رہا تھا۔ ہانگ بند تھی۔ سپیٹروں میں عجیب سی آہٹیں تھیں۔ وہ منہ سے ہی بی سانس لے رہا تھا۔ اور پھر ایک طویل سانس کے ساتھ ہی جسم کے پچھلے سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے اپنے ہی پائینٹی کھڑے ہو کر دیکھا۔ اس کی بیوی اس کے جسم پر چھکی ہوئی تھی۔ اور بے تاملہ دور رہی تھی۔

”اپنے جیل ہونے کا تم کو بہت جرم فانا! دیکھو میں آزاد ہو گیا۔ اب ہر قید سے میں آزاد ہو گیا ہوں۔“

وہ چپکے سے جوتی باہر نکلا۔ دواجنی زخمی رہی اس کے منہ پر تھا۔ اور پھر انہوں نے اسے دیوچ لیا۔ اور اس کی مشکیں کس دیں۔ اس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

”جو آج آپ اسے واپس تو لے لے۔“

مدوم، جانی انجانی سمدتیں خوشی میں منار ہی تھیں۔ گاڑ



مختار احسن انصاری



اظہار فاروقی



ناہید سلیم

جذبہ رشک و حسد قابل چالاک میں ہے
ڈھونڈتا ہے کہ چھپا کون دل چاک میں ہے

یترے مجذوبے جلوؤں کو ترے دیکھ لیا
کھہر رہا ہے کہ گلِ دلالہ کی پوشاک میں ہے

ایک ننھا سا بزدل سپی، غافل تو نہیں
جانتا ہوں کوئی صیاد مری تاک میں ہے

جمع بن جائے تو سب زیرِ زبر کر ڈالے
ایک آواز جو عافی دلِ صد چاک میں ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اب جنگِ خلا میں ہو گی
کتنا انمولِ خزانہ ہے جو افلاک میں ہے

دیتا یا ب بھی دیکھتا چن لائے گا
وصلہ انا سمندر تو ہے تیرا گم میں ہے

غرق ہو جاؤں گا میں اُس کے تصور نے کہا
کیسا طوفانِ ترے دیدہ ننگ میں ہے

● آئینہ کو لہڑا، دوسرا منظر۔ ایسا وی پی روڈ۔ بمبئی ۴۰۰
● ۲۴۶۔ پری پری ہسپتال، جناح لال ہیرو، نوید سٹی ٹی ڈی۔ ۶۷

جب نہ ہو تخلیق میں اپنے مسائل کا بیاں
دوستو! قتلوں میں پھر تاثیر کا جادو کہاں

زندگی کھرتی رہی کتنی ہی بزمِ آرائش
میری قسمت میں رہیں، تنہائیاں، رومائیاں

ہے ہر اک در تک شکستِ خواب کا دھڑکاٹے
اور میں تعبیر کے در پر کھڑا ہوں بے زباں

عمر بھر پر چھائیوں سے میں نے سمجھتے کئے
میری دلی بے بہت ہیں، میری منزل بے نشان

ہے فریبِ آگہی کی دھند تاحیدِ نظر
اور سر پہ ہے غبارِ روز و شب کا سا بھان

کامزن ہے قافلہ اس دوہر کی دھوپ میں
اب کسی سائے کا بھی مقابلہ نہیں کوئی نشان

اس سمندر کا سفرِ اظہار مری تقدیر تھا
جس سمندر کی غینِ سدی کشیاں بے باداں

● ۲۴۶۔ پری پری ہسپتال، جناح لال ہیرو، نوید سٹی ٹی ڈی۔ ۶۷
● ۲۴۶۔ پری پری ہسپتال، جناح لال ہیرو، نوید سٹی ٹی ڈی۔ ۶۷

یہ لالہ زار بھی میرے یہ دیرانی بھی میری ہے
اگر میں ضدیہ آجاؤں تو سلطانی بھی میری ہے

بہت بے چین رکھتی ہے مری تشنہ لبی مجھ کو
ترا قبضہ ہے دریا پر یہ نادانی بھی میری ہے

بہت سر چڑھ کے بولے گا یہ میرے شوکر کا جاڑ
رہائے میں جدا سب سے غزلِ خوانی بھی میری ہے

جہاں جا ہوں وہیں سجیں کی ہر بنِ ثبوتِ کردنگا
زینِ داسماں میرے ہیں پیشانی بھی میری ہے

نچے کب ماس آتے ہیں تیری محفل کے ہنگامے
نقیقت میں طبیعت کچھ بیابانی بھی میری ہے

● علی بکری، علامہ شاہ جہان، چاند پور۔ ۲۴۶-۲۵۰ (پولی)



دھیر میندا استقامت

نیچر لائبریری، روزنامہ جرنلسٹ ایکسپریس، ماہ زمین پبلیکیشنز، بمبئی ۲۱

میری فرنانڈس! کیا تم تک میری آواز پہنچتی ہے

پوریل، کاندیل، ملاؤ.... ملاؤ.... گوسے گاؤں... میری فرنانڈس!

میری فرنانڈس! ہر جگہ میری آنکھ کھل گئی۔ گاڑی جو گیشوری پر رکھی تھی۔ گورے گاؤں سے اگلا اسٹیشن جو گیشوری ہی ہوتا ہے۔ اوڑ گاڑی جو گیشوری پر رکھی تھی۔ تو پھر گورے گاؤں کے بعد میرے نیم خوابیدہ حلقے میں جو گیشوری کے بجائے میری فرنانڈس کیوں اتر آئی۔ گاڑی جبریل پڑی تھی۔ میں سر جھٹک کر پھر نیم خوابیدگی میں تھا۔

اندھیری، ولے پارے.... ساٹھا کروڑ.... میری فرنانڈس! میری فرنانڈس! میں بھی پھلانگ لگا کر اپنی زندگی سے باہر آگئی۔ گورے گاؤں پر رکھی تھی۔ کہاں ہے میری فرنانڈس! میں کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ جہاں لوگوں کا جھوم اپنی مشغول بے خبری میں اٹھکی بیلوں کی طرح پھرا رہا تھا۔ کیا ان کے بے خبری میں کوئی میری فرنانڈس مر رہا ہوگی؟ گاڑی پھر آگئی۔ بڑھ گئی تھی۔ میں پھر بند میں سرک رہا تھا۔

کھٹ کھٹ کھٹاک! کھٹ کھٹ کھٹاک! بیل سے دہرا فاسٹ گزر گئی۔ میری آنکھ کھلی۔ گاڑی باند رہے آگے جا رہی تھی۔ کون سا اسٹیشن آنے والا ہے؟ مقابل نے میری کسی بھیجیا کر بوجھا۔

میری فرنانڈس!... میرے ہونٹوں نے سرگوشی کی گاڑی باہم پر کھڑی تھی۔ اور سامنے ایسی کوئی ٹرک موجود نہ تھی۔ جو میری فرنانڈس سے رتی بھر بھی مشابہ ہو۔

تمہے کون میل کھا سکتا ہے میری فرنانڈس! تم تو تم تو.... میری پکیں منہ نہ لگی تھیں۔ وہ پال گھر کی شام تھی میری آسودہ، خوش حال زندگی میں بدھیمی کی طرح اتری ہوئی شام

لیکن اس وقت جب وہ وقوع پذیر ہو رہی تھی، ہاروں طوفان کے ہی کھ کھرا ہوا تھا۔ خوشگوار سردی کے ساتھ مڑکوں پر اترتا سا نولا سا مقبائی اندھیرا کھ کھرا ہوا تھا۔ وہاں میرے اپنے مہانگے کا گھنا اور بے کمرل شور نہیں تھا۔ کوئی کسی کے کندھے نہیں پھیل رہا تھا۔ کسی کو کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ کتنے دن.... جس کتنے برس بعد میں سکون میں تھا۔ مڑکے کنارے بازار بھی تھا۔ تانہی بدن ادب تکے میں نقش و دل کوئی باتیں خبرداروں کو اپنی اپنی پھیلوں کی نایاب خصوصیات کو اپنی تھیں۔ دور.... بازار کے اس پار گھینوں میں برف، بیسی سیدرنگ کی چادریں بھی ہوتی تھیں۔ ہرندے اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ نہیں، آج تو میں گھر میں جاؤں گا۔ کسی سنگی جھنک طرح اس خواہش نے سراٹھایا۔ آج رات تو میں قیام کرنا ہے۔ رکنے کا پیرہہ دفتر دے جاؤں گا۔ دفتر والوں کو کیا معلوم کہ میرا کام آج شام ہی انجام پا چکا ہے۔ اسے کل ایک آرام سے کھپا جا سکتا ہے۔ بس میں پال گھر کی پرسکون مڑکوں کا پیرہہ آوارہ بن گیا۔

اے ٹی، نظر نہیں کرنے کا۔ دوں گا ایک لافا تو ساری آوازیں اتر جائے گی۔ جوتے میں شور مچ گیا۔ دو لوگ بڑ پڑے تھے۔ دکھ بھکی شکست، محنت اور تھکان کے درمیان ٹپڑ پڑے اس شہر کے لوگوں کو غصہ بہت جلد آتا ہے۔ لیکن اتنی جلدی وہ اتر بھی جاتا ہے۔ کسی کے پاس مسلسل تنازعے کے لئے قانون وقت نہیں ہے۔

لیکن پال گھر کی اس گہرائی ہوئی شام میں میرے پاس دھیر سا ر قانون وقت تھا۔ جس میں کافی کچھ میں نے خرچ بھی کر دیا تھا۔ تھکان اور خوشی کے درمیان پال گھر میرے اندر بچے کی طرح ہمک رہا تھا رات بھرنے کو تھی۔ اب میں میرے کی تلاش میں تھا۔ کسی نے بتایا کہ ہم، میں چلے جائے یہ پال کا بہترین ہو چکا ہے۔

رہنا کہ ابھی چند روز پہلے کامیاب اولہ پر مسرت زندگی گزارنے والے ایک بے قصور شخص کی دنیا بلا دھری برباد ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے میری غرض میں تم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ لیکن یاد رکھنا کہ آخری وقت میں بھی پرہیز و شریعت تم پر رحم کی بارش نہیں کرے گی۔

دن کی منت تک فٹ نہیں آئی تو میں بیڑ جہاں بڑھے نگا دوسری منزل تک پہنچے۔ پہنچتے پہنچتے ساتھی اکھڑ گئے۔ ایک رات دن خوف نے میرے اندر آنکھ کھولی۔ کچھ عرصہ، شاید دو سال یا تین سال یا چار سال بعد میں ان بیڑ جہوں پر نہیں چڑھ سکوں گا۔

اپنے کین میں داخل ہو کر میں سفاکی کر سی، اپنی میز اور اپنے ٹیلی فون کو کسی گم شدہ مسرت کی طرح چھوا۔ سب کچھ چلی تھا۔ کل کی طرح، ہر یوں کی طرح، پچھلے بھٹکے طرح اور اس سے بھی پہلے۔ اس بھٹکے کی طرح جس کی ایک شام میں پال گھر کے درمیں، میں، کبر و ان، باریکی ایک میز پر تھا۔ وہ بیگنی چلنے کے بدلے کے سرور میں۔

تجس فون کی گھنٹی بجی۔ اس طرف کسی عورت کی آواز تھی۔ میری فرنائڈس! میرے ذہن میں کوئی دیہ جلا اور بھگیا۔ مجھے نہیں بات کرنی تھی عورت سے۔ میں نے کہا اور فون کاٹ دیا۔ مجھ میں بھی سی ہونے لگی تھی۔ میز پر رکھنا پانی کا گلاس اٹھا کر میں نے تھوڑا سا پانی پیا اور توبے سے چہرہ صاف کرنے لگا۔

گھنٹی چربی، میں نے فون اٹھایا۔ فون مت کاٹا۔ میں استمنا ہو! ادھر سے آواز آئی۔ وہاں بولو! میں نے کہا۔ وہ میری چھوٹی سالی تھی۔ وہ دیدی بتا رہی تھی کہ جب سے آپ ہال گھر سے لوٹے ہیں، بے حد گم سم بہنے لگے ہیں۔ کیا ہوا؟

استمنا کی آواز بھی ویسی ہی تھی۔ اتنی ہی کھنک بھری متنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ میری فرنائڈس سے پہلے ولے دونوں میں۔ وہ کچھ نہیں! میں نے کہا! صرف تھکان ہے اور تھوڑا سا دفتر کا ٹینشن۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ دو چار روز میں؟

وہاں پرچ۔ کویتا کو سمجھا دینا! میں نے کہا اور فون رک دیا۔ کویتا میری بیوی تھی۔ اند پہلے میں استمنا سے لمبی لمبی باتیں کیا کرتا تھا۔ دو چار روز میں! میں نے دہرایا اور ہلکے سے کانپ گیا۔ اس بار استمنا کی گھنٹی بجی۔ ڈپٹی جی۔ ایم تھے۔

میں سم، شاید یہاں کا مشہور ہو چکا تھا۔ راستے میں جس سے بھی پوچھا تھا وہ فوراً رک کر اطمینان کے ساتھ رہنمائی دیتا تھا اور کچھ دیر میں گہری تھکان سے لدا ہوا میں درمیں سم، کے سامنے تھا۔ اس قصبے کے کنارے وہ واقعی ایک شاندار بڑا ٹنگ تھی۔ اسلٹ میں فواروں والا باغیچہ تھا۔ دروازے پر دربان تھا۔

والے، دروازہ چھوڑو! بابے سینٹرل اترنے کا ہے! کوئی نور سے میرا اور میری پکیں کل گئیں۔ کافی بڑی جھیر پانی دھینکا مشتی والی مانوس ادائیں گاڑی سے اتر رہی تھی بھاڑی کے پلٹے میں پھر نیند کی آغوش میں تھا۔

گمرانٹ روڈ۔۔۔ چرنی روڈ۔۔۔۔۔ مرین لائنس۔۔۔۔۔ میری فرنائڈس! اناٹھو پرج گیت آگئی۔ کسی نے مجھے جگا دیا۔ میں اٹھا۔ انگڑائی لی اور پھر گاڑی سے اتر گیا۔ اب مجھے ٹیکسی لے کر نرہیں ہوائسٹ جانا تھا۔

تم اس دن میری زندگی میں ایک نئے اور اصلی استعجاب اور ناقابل یقین انبساط کی طرح داخل ہوئی۔ میری فرنائڈس۔ تو پھر تم میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ کیسے بن گئیں۔ ٹیکسی سٹاپ کے کنارے سے گزرتی تھی۔ سڑک پر، کاروں کے بونٹ پر سڑہم کی میدانیں عریاں چھاتیوں اور جانکھوں کے ساتھ بے شری کی طرح موجو تھیں۔ شہر کی بنداس زندگی اور فلموں کی واقف ریا نیت نے انہیں بےیز طریقے سے لاپرواہ اور بولڈ بنا دیا تھا۔ لڑکیوں والی یہی شہر کے لسانی حسن کا ہونسا کی سے دھندلا آئینہ تھی۔

اسی گل میں کسی وقت گلے میں صلیسی مسیح کا گلاس ٹکائے میری فرنائڈس بھی لپا کرتی تھی۔

آہ! درد میری شریانوں میں تیزا بیک طرح اتر رہا تھا۔ پچھلے ہاں صرف چمکے گئے تھما سے ساتھ گزرنے کے بدلے متنی بار میں تمہارا نام لے چکا ہوں میری فرنائڈس اتنی بار تو تمہاری ماں نے تمہیں نڈر پیسے اپنی کوکھ میں رکھنے اور سولہ برس اپنے گھر آنگن میں ہانے کے باوجود نہیں لیا ہو گا۔

ٹیکسی رک گئی۔ میں باہر نکلا۔ سامنے بے کراں سمندر تھا۔ ہر (رنگ بے فکری سے باہر شہر کے سکھ اور قباخر سے بریز۔ اوبہائے ہوئی تھا۔ ایک سرس ماورس تھا۔ ایر لڈیا کی بلڈنگ تھی اسے چوبیس اور اٹھائیس منزلہ فلک بوس عمارتوں کا قہار گواہ

اس نے میرا نام بتایا اور بیٹھنے کے لئے بوجھا۔ میں جھینپ گیا اور جلدی سے بولا۔ وہاں ہاں بیٹھے نہ؟
وہ منٹ ۷۔ وہ مسکرائی اور گھوم گئی۔ اونچی اڑی کی سینڈل پہنے وہ کھٹ کھٹ کرتی کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھی۔

بے جھگوان! میری آنکھوں میں کتنے سارے انارکلیک ساتھ چھوٹے لگے تھے۔ اس کا دُدار کو چھونے کے لئے چھوٹے شہروں میں دنگا ہو سکتا تھا۔ اور اس پر اس کی چوٹی۔ اپنی اب تک کی زندگی میں نے اتنی لمبی اور پریشکوہ چوٹی نہیں دیکھی تھی۔ وہ گھنٹوں کے جوڑ سے بھی نیچے چلی گئی تھی۔ تھوڑی اور لمبی ہوتی تو اڑیاں چھو لیتی۔ وہ جب تک وہ کاؤنٹر پر بات چیت کر کے لوٹی۔ میں مارا جا چکا یہ چلی ہے! میں ابھی تک حیران تھا۔ "اے چھوکر دیکھو۔"

جواب میں وہ مسکرائی اور اس نے چوٹی کو میز پر رکھا دیا۔ میرا ہاتھ میں گلاس اٹھا کر بولی۔

"چیئرس۔ تمہاری لمبی، سکھی زندگی کے نام۔"
چیئرس۔ میں خواب میں چل رہا تھا۔ کسی جسمی کشش میں بہت اس عالم میں سرگوشی کی۔ وہ تمہارے ملکوتی من کے نام ۷ میرا پنے باتیں ہاتھ سے اس کی چوٹی سہلانے لگا۔ اس کا دوسرا اور میرا چوٹا پیگ ختم ہونے تک اس کے یہاں ہونے کا راز میں جان گیا تھا۔ کبھی وہ بھی سٹیم میں پڑھتی تھی اور مشہور ماڈل بننے کے خواب بنتی تھی۔ تبھی بد قسمتی اس کی زندگی پر فخر کی طرح فوٹ پڑی۔ سووی عرب میں دولت کمائے گی اس کا باپ وہیں کا ہو کر رہ گیا اور اس کی ماں کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے چکر میں پھنس گیا۔ ماں بے بسی میں ہے۔ چھ دن یہاں رہ کر ساتویں دن ماں کے پاس جاتی ہے۔ اس کی ایک دوست نے جو اپنا مہنگا جب خراج کمانے کا کام کر رہی تھی کبھی کبھی یہاں آتی تھی، اسے دسم سیم کا دروازہ دکھایا۔ ابھی تک سرخڑی ہے۔ تھوڑا اور پیچھے ہوتے ہی یہاں سے نکلے گی۔
"میں اس سے مل کر ترجمہ آمیز محبت سے بربز ہو گیا تھا۔"

کیا تمہیں پایا جا سکتا ہے؟ اس کا سچ جان کر میں نے اسے اپنی خواہش سے آگاہ کیا۔

وہ رات بھر کے بارگاہ سورویے کاؤنٹر پر جمع کر دیئے۔ وہ اپنے لاکٹ سے کیلئے لگی۔

میں نے فوراً پر سے بارہ سو روپے نکال کر اسے تمنا دینے

کچھ دھڑلے سے تمہارے کام میں سستی آگئی ہے ۷ وہ پوچھ رہے تھے۔ ٹانگہ کر نہیں، پیاسے۔ کتنی ساری مزدوری فائلیں تمہارے پاس آگئی پڑی ہیں ۷

وہ ساری سراء میں نے ادب سے کہا طبیعت تھوڑی سست رہی اس پیچ۔ شاید موسم کی وجہ سے ۷

موسم؟ موسم کو کیا ہوا؟ وہ تو بہت شاعرانہ ہے۔ ابوں نے یاد دلایا کہ میں جون جولائی نہیں ۷ دسمبر کے شہر میں ہوں۔ وہی ۷ میں نے کہا۔ دین دن میں ساری فائلیں پٹنا ہوں ۷ کوئی پر اہم ہو تو بولوں ان کے اندر کا بڑا بھائی جاگ گب تھا۔

وہ نہیں سر ۷ خینک بو، خینک بو دیر کی بج ۷
"او۔ کے۔ گواہ ۷ ابوں نے فون رکھ دیا۔

گواہ ۷ میں بڈ بڈایا۔ لیکن کہاں؟ میں نے سوچا۔ اور سارے امکانات پر راہ گھرنے لگی۔ صدی کے سب سے کرناک ایسے میری رو جگے مل رہی تھی۔

دکبروان، میں اتنا دکا لوگ ہی تھے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں اتنی ہنگامی قیاشی کون کر پاتا ہو گا۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ رزم جھم کرنے نیلے اندھیرے کے بیچ نمبر سے پیگ کا سرور پر سکون ارتعاش میں خوشگوار انگڑیاں لے رہا تھا۔ میرے سہلے میرا تنہائی بیٹھی تھی۔ پیگ ختم کر کے سرخوں پر جھکنے کا فیصلہ میں کر چکا تھا کہ اس کے میرے دائیں کان کی طرف ستار سا بجا۔ میں آ۷ کے ساتھ بیٹھوں؟

دھیے دھیے تھر تھراتے اپنے چہرے کو میں نے دائیں جانب گھمایا اور شہدہ رہ گیا

مانے کوڑے بدن سے جو روشنی بھر رہی تھی۔ اس کا سامنا کر کے میرا شہر سار ہو سکتا تھا۔ میرا ملک اشتعال حیرت زدگی میں ڈھل رہا تھا۔

دونوں ہاتھ میز پر لگا کر وہ تھوڑا سا جھکی۔ اس کے گلے میں لٹکا بیٹھی میز کا لاکٹ باہر کی طرف بھول آیا۔ وہ میکی کے اسٹائل وولی کوئی شان دار لباس زیب تن کئے ہوئی تھی۔

میرا نام میری ہے۔ میری فرمائشیں۔ میں آپ کے ساتھ ۷
"اس وقت مجھے سو کر اس کے دو دھیا اب اس کو تک رہا تھا"

جس نے خود کو سنبھال لیا۔ یہ میرا پیار ہی ہے۔ میں بدبایا۔ اور پھر
شیو کرنے لگا۔

ساحنے مکھ لیتے ہیں میری فرنانڈس اچھر رہی تھی۔ بے باس
میں پانگوں کی طرح اسے چوم رہا تھا جگو جگو۔ وہ میرے کپڑے کھول کر
تھی۔ اپنی دونوں پستانوں کے بیچ اس نے میرا سر رکھ لیا تھا اور میری
گردن سہلانے لگی تھی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس نے میرا چہرہ
اٹھایا اور اپنے سگٹے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

سکھ میرے اند بوند بوند اتر رہا تھا۔

کچن میں کویتا نے کوئی برتن گرایا۔ وہ اپنے دکھ کے گھٹے جھجک
کی سفاک تہائی میں کھڑی باہی ہو رہی تھی۔

میں اپنا تویہ لے کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ کپڑے اتار کر جوں نے
شاوڑ چلا دیا۔ اوسکے دن ۶ میں نے سوچا۔ اوسکے دن اس شاوڑ
میں ہلنے کا سکھ پچا رہنے والا ہے میرے پاس ۶

میں نہا کر نکلا تو میری فرنانڈس پلنگ پر اسی لیٹی ہوئی تھی۔ میں
نے اس کے بدن پر ہاتھ چھرایا۔ اس کی گردن چومتے ہوئے بولا
بہت گہرا سکھ دیا ہے تم نے میری فرنانڈس۔ میں اس رات کو اور
تمہیں یاد رکھوں گا۔

دسکھ ۶ میری فرنانڈس پلٹ گئی

ارے ۶ میں چونک گیا۔ یہ کیسا بوجھ ہے میری فرنانڈس کا چہرہ۔

سکھ ۶ میری فرنانڈس کا چہرہ ایک ناقابل فہم سختی میں تھا۔

سکھ تہا میری زندگی سے رخصت ہو چکا ہے، مودھ آئی۔!

میری ۶ میں نے تڑپ کر کہا

دیس ۶ میری کھڑی ہو کر کپڑے پہنے گی۔ پھر میری طرف

چہرہ گھا کر بولی۔ زیاد تو تمہیں رکھنا ہی ہوگا۔

میں نے دیکھا، اسکی آنکھوں میں انتقام کے چاقو چمک رہے

تھے۔ ایک شاعر لیکن لا پرواہ ہنسی ہنسنے ہوئے وہ بولی۔ کپڑے

پہنو اور گھر جاؤ۔ میں نے تمہیں دس لپا ہے ۶ اس کی آواز پرتند

تھی۔

میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں میری! صاف صاف تاؤ۔ دیکھو میں

نے تم کو بیاہ رکھا ہے۔ میری آواز التجا کی طرح پھسل رہی تھی۔

تم میرے بیویوں شکار ہو ۶ میری عزائی۔ اب وہ اپنا بیٹی

سیج والا لاکٹ ہیں رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔ میں اس کے انتظار میں کانپنے لگا۔ کیسا
ہوگا اس کا بدن ۶ ایک مشعل چاقو میری منوں کو چیر رہا تھا۔

وہ آئی اور میرا ہاتھ تمام کمر پہل منزل ولس میرے کمرے کی طرف
بڑھنے لگی۔

وہ آئی کم ان ۶۔ کیمین کا سعاڑہ کھول کر ایک ٹکی جھانک رہی تھی
تم میری فرنانڈس تو نہیں ہونہ ۶، بے سافہ میرے منہ
سے نکلا۔

وہ نہیں ۶ وہ خوشی خوشی اندر آگئی۔ ۶ سر کیا آپ نے پہلے مجھے
کہیں دیکھا ہے۔ یا میری شکل میری فرنانڈس سے ملتی ہے ۶ وہ بے
تکلفی بڑھانے کی کوشش میں تھی۔ میں سمجھ گیا۔ یہ کسی اچھی کپنی کی
پی۔ آر۔ ادھے۔ مرد ہو یا عورت، پی۔ آر۔ اڈو میٹھی، نرم اور
انیت سے بھری زندگی جینے کی ہتی خواہ ملتی ہے۔

کسی نئے پراڈکٹ کے اجرا کی تقریب کا دعوت نامہ دے کر اڈو
آنے کا پکا وعدہ کر کے اس نے ہاتھ ملایا۔ اس کے جانے ہی پانی بھرے
گلاس سے اپنا ہاتھ دھو کر میں نے تویہ سے پوچھ لیا۔

کر کے نیم تاریکی میں میری فرنانڈس کی نرم سانس میرے چہرے
پر بکھر رہی تھیں۔ اس نے اپنی چوٹی کھول دی تھی۔ بیویوں صدی کے
تام بچے ہوئے سال اس کے مدہوش کن بالوں پر پھیل رہے تھے
میں میری فرنانڈس کے کپڑے اتار رہا تھا۔

شیو بناتے وقت میں نے سامنے رکھے شیشے میں دیکھا۔ ہاتھ روم
سے نہا کر نکلا میرا بیٹا۔ میرے تویہ سے اپنا بدن بوجھ رہا تھا۔ جھن
سے میرے اندر کچھ ڈٹ گیا۔ میں لپک کر اٹھا اور بیٹے کے کمال پر
چاٹا جڑ دیا۔

دیکھا ہوا ۶ چلانے کی آواز سن کر کویتا کچن سے دوڑی دوڑی نکلی
وہ میرا تویہ استعمال کر رہا ہے ۶ میں اپنے غصے کی انتہا پر
کھڑا کانپ رہا تھا۔

ارے تو اس میں چائنا مارنے کی کیا بات ہے ۶ پہلے بھی تو
کئی بار وہ تمہارا تویہ لے کر ہاتھ روم جاتا رہا ہے ۶ کویتا تنگ گئی۔
کچھ دنوں سے تم بالکل بدل گئے ہو۔ وہ بگڑی، پھر رو ہنسی
ہو کر بولی ۶

تم نے ہم لوگوں کو پیار کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔
وہیں کویتا....، میری سختی ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگی لیکن

و مہذب؟ میں نے میری کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ میں نے جسیں ایڈس دے دیا ہے۔ اس کی آواز پتھر تھی۔

دیکھا؟ میں گہرا کر پٹنگ پر گرا۔ وہ تم کو ایڈس ہے؟

ہاں۔

لیکن کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ مجھ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ میں رونے کو تھا۔ جسم کے سارے مسام کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے کس کا کیا بگاڑا تھا؟ میری صحت؟ اور تھی۔ جس طریقہ میں مجھے یہ سمجھ دیا میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ایک سبھی زندگی کا حال میں کچھ عرصہ کے لئے اس دنیا میں آئی تھی۔ مجھے کیا ملا؟ میری پر جیسے دورہ بڑھی تھی۔ الفاظ کو جہانے ہوئے وہ پھسکاری۔ جتنا بھی وقت میری تقدیر ہے اسے میں تم مردوں کی قسمت سزا دے کر میں لگا دوں گی۔ ساتھ میں تم برباد ہو چکے ہو۔ میری کھٹ کھٹ کرتی کرتے سے باہر چلا گئی۔ دروازہ دھڑام سے بند کیا اس نے۔

میرے سامنے، میرے منبر، گویا میری زندگی کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔

واہ میری.... یہ کیا تم نے؟ میں چہرہ ڈھانپ کر سکے لگا تھا۔

پانی چلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ میں ہاتھ روم میں کھڑا اور ہاتھ میری فرنائڈس کے جسم کا کوئی حصہ میرے جسم میں نہیں ہو گیا تھا جو مجھے ٹھن کی طرح لگاتا رکھتا تھا۔

باہر کو بتا ہاتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ میرے دروازہ کھولا۔ تو اس نے عجیب سے اعتباری سے مجھ کو دیکھا۔ پھر بولی۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟

کچھ بھی تو نہیں۔ میں نے مسکراتے کی کوشش کی اور کپڑے بدلنے لگا۔

اچانک اپنے کمر کے جاں بوا اندھیرے میں میں بہت اکیلا چھوٹ گیا تھا۔ میرا ڈر ہر روز بڑا ہو رہا تھا۔

میری فرنائڈس کی تم کو میری آواز سنائی دیتی ہے؟ اگر ہاں تو سنو! اتم خوش ہونہ؟ دوسروں کو ڈھٹے ہارے ہوئے دیکھ کر احیان ہوتا ہے نہ؟ ایک ظلم الطیان۔ لیکن کتنا کمینہ ہے یہ ایسا میری فرنائڈس تم سن رہی ہونہ؟ اپنے دکھوں کا مجھے وار کسے بنانا

ہوں میں؟ کتنا ہے پارہ اور ہے بس بنا دیا ہے تم نے مجھ کو! میری آنکھیں پلیدی طرح کھلی ہوئی تھیں اور مسلسل جھٹ سے متحارم تھیں۔

اچانک کو بتا پیٹی اور میرے اوپر آگئی۔

دارے! میں جھپٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا کرنے پر تلی ہو تم؟

ہم.... تم کو معلوم ہے.... کو بتا گھرے دکھ میں تھی۔ عورت ہونے کے باوجود آج میں پیش قدمی کر رہی ہوں۔ ہم نے دہیہنے سے بیا رہیں کیلے....

دو بیٹے؟ دہشت میرے دل کو دو بچ کر بیٹھ گئی۔ دو بیٹے کتنے بیٹے اور.... میرا ہر عضو تسخیر میں تھا.... اے کویتا.... کوئی میرے اندر برسر بیکار ہوا.... اے کویتا میں نہیں بنا دوں گی۔

میری پیشانی پر پسینہ تھا میں نے اسے ارقا ش تم پاگل ہو گئی ہو۔ میں نے غیر واضح الفاظ میں کہا۔ الفاظ کی محبت میں گہرے کانپ رہے تھے۔

دیکھا تمہاری زندگی میں کوئی اور آگیا ہے؟ کویتا پھر کئی تھی کوئی اور؟ میری فرنائڈس؟ میرا دل ڈوبنے لگا۔ لیکن میں نے طاقت بٹوری اور کویتا سے خود کو سٹایا۔ دو ماہ بعد ملی پیار کی گرمی میں وہ دھیمے دھیمے لگنے لگی تھی میں ہی۔

اچانک جذبات کے توجہ کے ان شدید لمحات میں میری آنکھوں میں میری خوشحال دنیا خوفناک ہیکوے لینے لگی۔

نہیں، یہ قتل ہے.... کوئی کیسے اندر برسر ہوا۔ دیکھ تمہاری زندگی کے رخصت ہو چکا ہے سو رکھا دمی۔ میرے فرنائڈس مسکرا رہی تھی۔

میں نے اسی لمحے کویتا کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور بستر چھوڑ دیا دھب کی سردرات میں اپنے زخم زخم آنسوؤں سے مجھے بدعا دیتی ہوئی کویتا اپنے کپڑے سمجھا رہی تھی۔

پتہ نہیں، میں اس کی زندگی میں جل رہا تھا یا وہ میری زندگی میں بکھ رہی تھی۔ جو بھی تھا وہ میری فرنائڈس کے انتقام کے سامنے میں توڑ ٹوڑ ہو رہا تھا۔

انتقام ہی کرب کے اس بے حد ٹھن لمحے میں کوئی سائل میرے اندر گھر گڑا رہا تھا.... ہے کویتا!



میرے دشمنوں کو کھیر دے دوست! تمہارا نقل نہیں ہو سکتا کچھ
سے۔ دیکھو، مجھے کچھ کی کوشش کرو۔ تم نہیں جانتے کہ میں تم سے کتنا پیار
کرتا ہوں۔ میرے پیار کا تم مجھ سے دور ہو۔ میرے سلسلے سے بھی پیار ہے
اب تمہیں۔ میں اس لئے کہ وہ دنیا کے لئے اچھوت ہو گیا ہوں۔
مگر کچھ نہیں سکا میں۔ رات بھر میرے اورد کو بتا کے درمیان ایک
ہا مستی زندگی بے مٹی ہو کر گئی رہی۔

عجیب و غریب مواصلات، المانیوں اور چھین وے کے ساتھ میں
مستقل مڈھیر میں چھن گیا تھا اور وہ بھی بالکل تھا۔ رشتوں اور فطرت
کی ایک خاصی تعداد کے باوجود میں اپنے دکھ میں اکیلا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی
سب سے زیادہ محبوب کو بتا کر بھی یہ نہیں بتا پا رہا تھا کہ میرا شکار
کیا جا چکا ہے۔

لیکن اس کا اختتام کہاں ہے؟ اپنے راز کو پوشیدہ رکھنے کی
صلاحیت نکلتا دکھت رہی تھی۔ دکھا اور چھینا وے کی سب سے اونچی
پوئی پر ایک گیا تھا۔ میں اور مجھ سے باہر ہوئی زندگی وے ہی رواں دوا
اور جاواں تھی جیسی کہ اسے ہونا چاہیے۔ خنداں سے ہرگز اور خون
کی طرح گرم۔

خون! میری سحر کو جھٹکا لگا۔ اپنے خون کی پہلے بھی تو کر دے سکتا
ہوں میں۔ میرے فوراً خون اٹھا یا اور اپنے ایک ڈاکٹر دوست کا نمبر
ڈائل کرنے لگا۔ لیکن ادھر سے پہلو آنے پر ریسیور میرے ہاتھ سے
چھوٹ گیا۔

دشمن طرح کے سوال کرتا ڈاکٹر۔ تمہیں جانچ کیوں کروانی ہے؟ کم
خدا جگہ چلے گئے تھے کیا؟ تم تو ایسے نہیں تھے؟ اور جانچ کا نتیجہ اگر
مثبت آیا تب؟

میرے نے دیکھا۔ میں سڑکوں پر بدھوں میں جھانکا جا رہا ہوں۔ ایک
جوہم اپنے مشتعل شور کے ساتھ میرے پیچھے ہے۔ جس دہ اندسے کے ساتھ
جا کھڑا ہوتا ہوں وہ تڑاک سے بند ہو جاتا ہے۔ جوہم کا خیال ہے کہ ایک
اندھیرا مذکورہ میرے سلسلے زیادہ مناسب ہے جس میں جی جی کر کے گلنا
ہے ہے۔

دو دن پچھلے ہی پہلے سے ترخیں میری۔ ان دنوں کچھ نیا ہوا
سبز آنے لگا ہے۔ مجھے کچھ ہانک اٹھنے پر مجھ بھی آتا ہے۔ اکثر
بھوک کا بھی احوال ہے۔ زبان پر ایک میٹک قسم کی بد مزگی
مستقل ہو گیا ہے۔ میرے دل میں اس لئے کہ مجھ کے گلنے میں ہوں یا

میری فرمائش کا اور جان پہل پہل ہوتا ہے۔
اور اپنی بے پادگی کے اس بے پناہ وقت میں مجھے میری فرمائش
کی یاد آتی۔ تم کہاں ہو میری فرمائش اس اور کیسے ہو؟ تم بھی تو گلی میں
ہو گی نہ؟ میرے بعد اس کے لئے شکار کرتے ہیں تم نے۔

کیا میری فرمائش کو کوئی نہیں کرایا جاسکتا؟ میرے دل میں ایک
قحطی خیال اٹھ اورد کو کھڑا کر گیا۔ اس بارے میں اگر میں ایک صحافی
دوست سے بات کروں تو وہ سب سے پہلا سوال ہی کہے گا تمہیں
کیسے معلوم کہ سن کی وہ دہائی محبت کے گداز حالت میں موت کا تھفہ
داشتی ہے۔ پھر وہ خبر چاہا ہے گا۔ اور اپنی زندگی میں یہی اسی
کیا رہ جاتے گا۔

سب سے اچھا ہی ہے دوست۔۔۔ کسی نے میرے اندر پلکے سے
سروشی کی کہ تم نا موخی سے نکل لو۔ آج نہیں تو جاؤ سال بعد تمہیں ویسے
بھی اس دنیا سے رخصت ہونا ہی ہے۔ لیکن یہ رخصت کتنی شرمناک
اور اذیت سے جبری ہو گی! ابھی کسی کو میرے قبلے، بغیر آہٹ کے
نکل چلو گے۔ تم کم سے کم کوئی ناکی زندگی تو بے خطر اور بے تحاشہ
بنی رہے گی۔

تو؟ میرے اندر فیصلے اور تذبذب کا کھلنے کا ہی تھی۔ ساتھ
کا دیوار پرینگ ایئر انڈیا کے کلائڈ پر کوئی ایئر ہو سکتی تھی کہ پورے
میں کھڑی تھی۔

ہانک نہ ہانے مجھے کیا ہوا کہ شری میں برق رفتاری سے اٹھا اور
ٹائیس اٹھا کر ایئر ہو سکتی پر پٹنے لگا۔

آخر تک کہ میں پھرتی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہانے لگا۔ میری آنکھ
سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اور میں بیدار رہا تھا۔ میں تھک گیا ہوں
میری فرمائش اس۔۔۔ اپنے آپ سے طرے طرے میں بہت بہت تھک
گئی ہوں۔ تم سن رہی ہو میری فرمائش اس! کیا تم تک میری آواز
پر پہنچتی ہے؟

ہندی سے ترجمہ
جاوید اقبال، معرفت جن سٹاڈیو، لاہور۔ زیر نگرانی پبلیکیشن





ہمدیپ ساحل

رنگزار و درو کی ساری کھٹا کہہ لیجئے
منزلوں پر جس جو کا مرثیہ کہہ لیجئے

ایک رشتہ ہے ابھی باقی ہمارا آپ سے
اب اُسے کہیے تصور یاد عا کہہ لیجئے

رنگ میں تمام اگر انی جگہ پر دوستو
پھر مری آنکھوں کو دھندلا آئینہ کہہ لیجئے

اب ہر اس وسعت شب کی یہی تدبیر ہے
چاند کو سورج، اندھیرے کو ضیا کہہ لیجئے

پوچھتے ہیں لوگ جب تم سے جبرائی کلب
کہہ دیا کرتا ہوں قسمت کا کھٹا کہہ لیجئے

اب کہاں وہ رنگ خون ل کی کلاسی کلاب
شعر گوئی کو محض اک مشغلہ کہہ لیجئے

ہم طے جاتے ہیں ساحل بلند شوقی ہیں
آپ چاہیں تو آگ کو انتہا کہہ لیجئے

● ۱۱۲/۷۱ - جہانگیر پوری، دہلی ۱۱۰۳۳

۵۰۹ - دہلی، مکتبہ دار العلوم، ضلع تھانہ - ۲۲۱۳۰۵



امیر حمزہ قاتب

خدا کے نام سے صرف نظر کیا
وہ ہر شے ہے ادھر کیا اور ادھر کیا

تو کیوں یہ سنگھاری ہو رہی ہے
میں آخر بن گیا شیٹے کا کھڑکھا

خود کے ہوش اٹھنے جارہے ہیں
جنوں کی آدھ ہے وہ گندو کیا

میں اپنے حوصلوں سے اندر ہا ہوں
مرے نزدیک ہیں یہ بال و پر کیا

مٹی کو فرصت گر پر نہیں ہے
ہم اپنے ساتھ دقتیں تو گر کیا

جھجک کیسی یہ جانے میکہ ہے
میں قاتب تیرے خیر و شر کیا

● ۵۰۹ - دہلی، مکتبہ دار العلوم، ضلع تھانہ - ۲۲۱۳۰۵

ہدایت کاشف

ہماری سوچ پہ ان کے کتاب کہتے ہیں
وجود ایک ہے لیکن عذاب کہتے ہیں

اب آئینوں کے نگر پہ نظر جو ڈالی ہے
جبین شب پہ کھلے اجتاب کہتے ہیں

سوال ترک تعلق کوئی تو کر لے
مرے لبوں پہ ترپتے جواب کہتے ہیں

خضر مزاج کوئی ہم سفر سینا ڈالو
روحیات میں درز سداب کہتے ہیں

نجانے کون سا چہرہ تمہارا اپنا ہے
نجانے رخ پہ تمہارے نقاب کہتے ہیں

یہ ادب ات کر صحرائے دل بھی پایا ہے
وگر نہ آنکھ میں اپنی سحاب کہتے ہیں

دیکھو دھوپ کے سورج کو کیا پتہ کاشف
مرے تپ میں سناٹے کلاب کہتے ہیں

● ۵۰۹ - دہلی، مکتبہ دار العلوم، ضلع تھانہ - ۲۲۱۳۰۵

آزمایش فواید آب و "نیتراژ" آب و خاک

مجلس میں حیران کیا کہ انہوں نے فریاد کیا کہ ہمیں کسی
کسی شخص کے بارے میں علم نہیں تھا کہ وہ ایسا ہے۔
اس لیے کہ اسے وہ حضرات انہیں "تقریباً" کہہ چکے تھے۔

اور مل ساری ناپاکی کے سب سے بڑی صفائی
کے بعد کہ کل پہاڑ تک تو مچا ہے تپا ہے بھی
اس طے بھی جس بڑی کثرت رہا ہے اس کے
مذکورہ قبیلے سے اس کثرت جنوں کو سے میں
بھی سمجھتے ہیں مل رہا ہے۔ ہوا اٹھانے سے
ظہر کے تپ کے کہ کثرت کثرت کو رہا ہے تپ
کو نہیں اور اس قسم کے طے اس وقت بہت بڑی
سے ہے تپ رہا ہوا اٹھانے کو رہا ہے تپ سے نزدیک
کے لیے کہ تپ کی تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ
میں کہ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ
بھی حاصل رہا ہے۔ یہی کہ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ تپ
ناپاکی کے سب سے بڑی صفائی
کے ہوا اٹھانے سے

[illegible]

☆ انیسویں صبح۔۔۔ شنبہ ۱۵؍

لکھنؤ۔ ایک نرغور۔۔۔ ٹی لس کے لئے پیپر
میں سے نکلتا تھا کہ پیر اس میں یہ کہ لکھنؤ
سلاخ عرب کا جو قبیلہ ۴۲۷ء ق۔ قبل از ہجرت کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

امریکی - ۱۹۹۵ء

ظاہر کے دونوں جزو ٹوٹے تھے۔ ظاہر کے ابد سے
 میں اور اس کی طرح میں بھی بہت کم کہا جاتی ہیں مگر
 میری دشمنی ہے کہ اگر میں تمام امور و مسائل کے
 بارے میں میں کسی شخصیت کو فرما کر یا گھٹنا شروع کروں تو
 میری شخصیت میں کیسے عمل پائے۔ یہی اسی مجھ کی وقت
 کا دور تھا۔ پہلی بار۔ دیکھو تو ظاہر میری طرف سے ہی تھا
 لیکن اس بار کے دونوں ٹوٹے میں کیسے ہی بد وقت
 دیکھو یا سمجھو۔ مضمون چھوڑو۔ طلبہ ہے۔ انداز ہی تھے
 میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بڑی مادی ہے۔ "دراپہ"
 اور دھاری (جسے میں بھی کچھ شروع دیا۔ کہا میں تھا۔
 ہر سال لایا کیا تھا۔ ایک دو آٹھ سو بیسویں کر کے
 دے کے کچھ دے تھا۔ سرور اور علی کہانی میں نہ تھا۔
 کہا تھا کہ اس میں بار کچھ ہی ہے۔

یہ محمود ہاشمی۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ ۱۹۰۷ء۔ قادیان
فلسفہ کے نول شش ماہی عمر، کل۔ بارہ ماہ

HAVE YOUR UNIT #1
 * مقصود الہی ہے
 * خدائی کلمہ کہ آپ کو اور اس کی
 رہنمائی کے لئے ہے
 کے لئے ہے کہ وہ اس کی
 اپنے لئے ہے کہ وہ اس کی
 میں ہے کہ وہ اس کی

مجلس شورای اسلامی

[illegible]

عقلی اور فنی پہلی روایت اور حدیث کے نقل
اور پہلی فہرہ کی کوہنہ پہلے کی کوہنہ کر کے نقل
کیا نہیں ہے؟ اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ
یہ وہ پہلی فہرہ ہے۔ اور پہلی فہرہ
اور اس میں نقل کیا ہے اور فنی پہلے کے
مصرح کہ یہ وہ پہلی فہرہ ہے۔ اور پہلی
اور پہلی فہرہ ہے۔ اور پہلی فہرہ ہے۔ اور پہلی
کے کلمہ اور روایت کو چار چار قبضہ کے مفرد
مقام حاصل کر کے نقل کیا ہے۔ اور پہلی
مصرح کہ یہ وہ پہلی فہرہ ہے۔ اور پہلی

[illegible][illegible]

☆ بغیر فقیر الحسن - سید احمد علی - سید احمد علی

[illegible]

آئے ہیں مجھ سے یہ مفاہیم خفا میں
سروش جانی کہ مجھ سے کہتے ہیں کہ جس نے سنی
قرعہ میں کون نہیں نظر آتی ہیں:

۲۰ تا ۳۰ سالہ ایک عورت کا
بیماری میں جس کو وہ توبہ کرنے کی تلقین کیا گیا تھا
محول کے پہلی دو گھنٹے کو مشغول کر لے گی۔ بہت جلد
یہ بیمار ہو کر مر گئی۔

ہائے دیکھ، وہ بھی، وہیں رہو اور
جہاں کہ ہو، یہی طریق مسال کی ہے

سچے تجربوں اور گہرے مشاہدوں کے شاعر عتیقہ النظر

کی غزلوں اور نظموں کا اولین مجموعہ



● موجودہ نئی نسل میں عتیقہ النظر ایک اہم نام ہے۔ نظرنے اپنی شاعری کو سجانے کے لئے مرد و عورتوں کو بلیا اکیوں کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ دوروں، بینوں اور انکشافات ذات کے عمل کو دلنیل راہ بنا کر انہیں، نئے مفہوم سے آشنا کیا ہے۔ اس عمل سے اس کی غزل اور نظم دونوں میں روشنی بھی پیدا ہوئی اور گہری بھی۔ النظر کی غزلوں اور نظموں کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تھوڑے سے اور تازہ ہوا کے تھوڑے سے میرے دل و دماغ کو سدا داب اور دھڑک کر دیا ہو۔ النظر کی شاعری میں یہ یکجہ تراشی نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ہے۔

جگت ناتھ آزاد

● عتیقہ النظر کی شاعری میں جا بجا تازگی اور ندرت بخش تازگی کی جھلکیاں ملتی ہیں، جن سے ان کے اردو و سنی کی نئی امیدیں بندھتی ہیں۔

محمد حسن

● یہ بڑی بات ہے کہ اتنی کم عمری میں آدمی کی منت کر پختہ ہو۔ یہیں گلت ہے کہ نظر ایسا شخص ہے جو اپنی آواز کی تلاش کر رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب وہ اپنی انفرادیت اور اپنی آواز کو بولے گا۔

خلیق انجم

● عتیقہ النظر کی شاعری اور کھیلے دس برسوں کی شاعری میں دو، تین باتوں کا سبق ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بشیر نظیں جو بچوں اور نظموں کے مجموعوں میں شائع ہوتی ہیں وہ مندرجہ تفصیلات کے مجموعے ہیں لیکن النظر کی نظیں مندرجہ تفصیلات کا مجموعہ نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے نقطہ تکمیل پر ایک نایابی محفل کی منزل کو پالیتی ہیں۔ یہ بات اب بہت کم شاعروں میں ہمارے ہاں نظر آتی ہے۔ النظر کے ال محفل مستعدہ اور تجربہ ہے۔ ان کے بعض شعروں میں تہہ داری بڑی سادگی سے ادھر بڑی جہتوں سے اظہار موجود ہے۔ ان کا یہ اولین مجموعہ بڑے امکان کا مجموعہ ہے

بدراج کھنول

● عتیقہ النظر نے بڑی حد تک اپنی لفظیات خود منتخب کر لی جو کوشش کی ہے۔

زیبہ صوی

● عتیقہ النظر کے ہاں تجربوں کا تنوع، انفرادی جرات اور مدد خیال کی سہارا دہی ہے۔ انھوں نے نئی نئی زمینوں اور خوبصورت رویوں میں غریب ہیں اور ہدایت ہی خوبصورت علامتیں اپنی غزلوں میں استعمال کی ہیں۔ ان کی بشیر سگریں نئے لب و لہجے کی ہیں۔

مرنعت سروس

● پہچان کا مطالعہ شعر سے شفقت اور شعر گوئی کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

مظہر الحق

معیاری کتابت، طباعت، کاغذ اور مضبوط جلد

صفحات: ۱۹۲ * قیمت: اسی روپے

ملنے کے پتے

- ◆ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) اردو گھر، رازداریو۔ نئی دہلی ۱۲
- ◆ غالب اکاڈمی، بستی حضرت نظام الدین - دہلی - ۱۲
- ◆ مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، امین آباد - لکھنؤ
- ◆ ناز مسطور - پوسٹ بکس ۱۸۶، دوحہ - قطر
- ◆ سید صدیق حسین، پوسٹ بکس ۹۷۳۸۷ - راجی
- ◆ ASIA PUBLICATIONS
- ◆ 7495 HURDLE CRESENT SURREY
- ◆ B.C. ۷3W 8T8 CANADA

بہارِ م جلس شروع اردو پوسٹ بکس ۶۹۰۱ - دوحہ - قطر - فون نمبر: ۸۷۱۰۴۰

THE "SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 004

66 Years of Publication • Publishing Date 27-28 • Issue JUNE -1994 • Tel. No. 382 99 04

Registered with the Registrar of Newspapers at R N. No 14482/57

پورے کیوں نظر آئیں؟

جب آپ کا دل ہو جوان



دردت سفید بالوں سے خود کو
پورے جھانک سوس نہ لیں۔ ان
سفید بالوں کو کالا بنائیے اور
جوان نظر آئیے۔ بالکل اپنی جوان سنگوں کی صورت
سپیر وسمول 33۔ ۳۳۔ ۳۳۔
یکے۔ جو قدرتی انداز سے برشے ہر صاف اور
آسان طریقے سے، ایک بال کا لے بنائے۔
یہ ہی بوتلی میں حاضرت نہ ملانے کی ضرورت۔
نہ گرنے بھرنے کی فکر۔



سپیر وسمول 33

مانوں کو کالا بنانے کا قدرتی طریقہ
مفت کتابچے کیلئے لکھیے

ہائیجینک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، پورے تجس نمبر ۱۱۹۲-۱۱۹۱-۱۱۹۰-۱۱۹۰

HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE P.O. Box 132 Bombay 400 001

